عتیق صدیقی

یادوں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

یادوں کے سائے

حضرت عتیق صدیقی کا تحفہ
شکریہ
27/2/75

یادوں کے سائے

عتیق صدیقی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دلی ۱۱۰۰۲۵

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دلی ۱۱۰۰۰۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

۱۹۷۴ بار اوّل قیمت ۱۸/-

(کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی)

پیش لفظ

یادوں کے سائے — خود نوشت ہے یا لغو نامہ؟ رپورتاژ ہے یا تاریخی تجزیہ؟ ناول ہے یا افسانوں کا مجموعہ؟ کتابی دنیا کی کس صنف سے آخر اس کا تعلق ہے؟

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے!

لیکن اس کتاب کے بارے میں یہ بات قطعیت سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ اور جو کچھ بھی ہو، مگر ناول یا افسانوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب میں جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے وہ افسانوی ہے، لیکن جو باتیں اس میں لکھی گئی ہیں وہ، کم و بیش، اسی طرح ظہور پذیر بھی ہوئی تھیں۔

پیش نظر کتاب کا تانا بانا تو ہندستان کی — چار دہائی پہلے کی — سیاسی تاریخ نے فراہم کیا ہے، لیکن اس کا اسٹیج بنت النیل کا قلب — قاہرہ ہے —، اور ضمناً ارض لیلیٰ اور دیار شیریں — بغداد و تہران بھی ہیں، جہاں اس ہندستانی ڈرامے

کے پردے اٹھتے اور گرتے رہتے ہیں۔ واقعات وہی ہیں جنھوں نے غیر منقسم برصغیر کی زلفوں کو سنوارا کم اور الجھایا زیادہ ہے۔ اس وقت ہماری تاریخ عبوری دور سے گزر رہی تھی۔ ایک طرف دو صد سالہ برطانوی عہد دم توڑ رہا تھا، اور دوسری طرف نیا ہندستان جنم لینے کے لیے بے قرار تھا۔

دوسری جنگ عظیم اس وقت آخری اور فیصلہ کن منزل سے گزر رہی تھی، بلکہ بڑی حد تک گزر چکی تھی۔ اتحادیوں کو فیصلہ کن کامیابی سے ہم کنار کرنے میں ہندستانی نوجوانوں نے بھی، خوش دلی یا بے دلی سے، نمایاں حصہ لیا تھا۔ لیکن اس کا یقین تھا کہ جنگ کے خاتمے پر ان کا دیس بھی، ان کی قربانیوں کے صلے میں، آزاد ملکوں کی برادری میں باعزت مقام حاصل کر سکے گا۔ ملک کے سامنے اس وقت جو سیاسی مسائل تھے، ان کے بارے میں بھی ہندستانی جوان، غلط یا صحیح، مگر قطعی رائے رکھتے تھے، اور اپنی رائے کا احترام کرانے پر وہ مصر بھی تھے۔ آگے آنے والے صفحات کا ابتدائی حصہ ہندستانی جوانوں کے ان ہی جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں نہرو، جناح، مہاراج سنگھ، آصف علی، آغا خان اور بعض دوسری سیاسی شخصیتوں سے آپ کی ملاقات ہوگی۔ یہ لوگ یورپ اور امریکا جاتے ہوئے، اور واپسی میں بھی، قاہرہ میں موسمی پرندوں کی طرح چند گھنٹوں سے لے کر چند دنوں تک قیام کرتے، اور دیس سے دور رہنے والے اپنے ہم وطنوں کو بتاتے کہ ان کا ملک کن مسائل سے دوچار ہے، اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ کیا جتن کر رہے ہیں۔

اس دور کے عراق، ایران اور مصر کے سماجی و سیاسی رجحانات کا بھی ضمناً کتاب میں ذکر آگیا ہے۔ اسی طرح پچھلے بیس برسوں میں وہ رومانی حادثات، بھی اس میں در آئے ہیں، جن سے بیشتر مسافر غیر ملکوں میں طویل قیام کے دوران اکثر دوچار ہوتے ہیں، اور جن کے ذکر سے، انسانی زندگی کی طرح، اس کتاب میں بھی شاید کچھ تنوع پیدا ہوگیا ہے۔

مصنف کی حیثیت ایک ایسے راوی کی ہے، جو ٹیپ ریکارڈر، یا روایتی راویوں، کی طرح واقعات کا محض تماشائی نہیں رہا ہے، بلکہ واقعات کے دھاروں میں، اور کرداروں کی طرح، خود بھی زیر و زبر ہوتا رہا ہے۔

کتاب کی شانِ نزول کا ذکر نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی۔ اس کی تیاری میں میرے ارادے سے کہیں زیادہ میرے مرحوم دوست محمد یوسف جامعی کے اصرار کو دخل تھا۔ اگست ۱۹۶۵ء میں پرچم ہفتہ وار دہلی کے آزادی نمبر میں میرا ایک مضمون "قاہرہ میں نہرو اور صباح کی ایک شام" شایع ہوا تھا، جو یوسف مرحوم کو بہت پسند آیا۔ مکتبہ شاہراہ سے شایع کرنے کی نیت سے اس کے باقی حصے بھی انھوں نے پیچھے پڑ کر لکھوائے۔

کتاب کا نام "میرا ہینی"، ڈاکٹر خلیق انجم کا تجویز کردہ ہے، جو تصنیف و کتابت کی ابتدائی منزلوں ہی میں، مکتبہ شاہراہ کی ایک صحبت میں طے پایا تھا۔

یہ ایک افسوسناک اتفاق تھا کہ کتابت مکمل ہونے کے چند ہی روز بعد خود یوسف مرحوم کی کتابِ زندگی کی بھی تکمیل ہو گئی۔ دوسرا سانحہ یہ پیش آیا کہ ان کے انتقال کے چند ماہ بعد مکتبہ شاہراہ میں آگ لگی اور مکتبے کے بیش تر اثاثے کے ساتھ اس کتاب کی کتابت شدہ کاپیاں بھی نذرِ آتش ہو گئیں۔

گزشتہ سال اس کتاب کا ایک باب رسالہ جامعہ میں شائع ہوا تو مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں نے اس کی اشاعت کا ذمہ لیا، اور اب یہ کتاب انہی کے انتظام و اہتمام میں شائع ہو رہی ہے۔ کاغذ کی موجودہ کم یابی کے پیشِ نظر کتاب کے بعض درمیانی اجزا حذف کر دیے گئے ہیں۔ اس عمل نے کتاب کے آزاد حصے کو خصوصیت سے متاثر کیا ہے۔ بہر کیف اس کی اشاعت کے لیے میں شاہد علی خاں کا ممنون ہوں۔

یکم دسمبر ۱۹۷۳ء
جامعہ نگر۔ نئی دہلی

عتیق صدیقی

ترتیب

إلی الکاتب والصحفی المصری المرموق
المرحوم عبد القادر المازنی
وإلی ذکری الایام التی قضیتها فی القاھرۃ

نامور مصری صحافی اور ادیب
عبد القادر المازنی کے نام
اور اُن دنوں کی یاد میں جو قاہرہ میں گزرے

آغازِ داستان

ہندستانی نوجیوں کی قیام گاہ جزیرہ کیمپ سے نکل کر ـــــ جسے مصری اپنی بولی میں "گزیرہ کیمپ" کہتے ہیں ـــــ زمالک جانے والی سڑک میں نے پار کی۔ اب میرے سامنے ایک صاف ستھری اور کشادہ شاہراہ تھی۔ اس کے ایک پہلو میں قاہرہ کا مشہور، وسیع اور کشادہ پیاسٹر گارڈن[1] ہے اور دوسری طرف بوڑھے نیل کے طویل و عریض سینے پر الھڑ دوشیزاؤں کی طرح آوارہ پھرنے والی چھوٹی چھوٹی بے بادبان کشتیوں سے نیل کی نوخیز و مست خرام لہریں چھیڑ چھاڑ

---

[1]۔ پیاسٹر ایک مصری سکہ ہے، جو دس پیسے کے برابر ہوتا ہے۔ اس باغ میں داخلے کا ٹکٹ ایک پیاسٹر کا ہوتا تھا۔ اسی مناسبت سے اس کا نام پیاسٹر گارڈن ہو گیا تھا۔

کررہی تھیں۔ اسی شاہراہ پر دریا کے کنارے کنارے کچھ ہی دور چلا تھا کہ کسی نے، بے سان گمان، بڑی بے تکلفی سے آواز دی۔ لب و لہجہ عربی تھا، لیکن آواز جانی پہچانی معلوم ہوئی. پلٹ کر دیکھا تو سڑک کی دوسری پٹری پر کوئی ہاتھ ہلا ہلا کر مجھ ہی کو مخاطب کررہا تھا۔ یہ تھے فخری شہاب —— ریڈیو بغداد کے ڈائرکٹر جنرل۔

فخری کو دیکھتے ہی بغداد کے قیام کی بہت سی یادیں، جن پر تہران اور قاہرہ کے قیام کے نقوش کی موٹی موٹی تہیں جم چکی تھیں، ذہن کے پردے پر یکایک ابھر آئیں —— بغداد کا ریڈیو اسٹیشن، جہاں سے ہندستانی فوجیوں کے لیے ہر روز خبریں اور تفریحی پروگرام ہم نشر کیا کرتے تھے؛ دجلہ کا شان دار پُل، جس سے متصل ہمارا دفتر تھا اور جس کے ایک سرے پر شاہ فیصل کا اسٹیچو اور دوسرے پر شارع الرشید، جہاں چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی فیشن ایبل دوکانیں ہیں؛ اعظمیہ کی عالی شان جامع امام الاعظم، جس کے ایک گوشے میں امام اعظم ابوحنیفہ کا سادہ سا کچا مزار ہے؛ مسجد الگیلانی —— جہاں شیخ عبدالقادر گیلانی کا مزار اور خانقاہ بھی ہے اور جہاں بھیک مانگنے والے ہندستانی فقیر بھی مل جاتے ہیں؛ مرقد السیدۃ زبیدہ —— ہارون الرشید کی چہیتی بیوی زبیدہ کا مندر نما مقبرہ، جو ہندستان اور عراق کے قدیم ثقافتی تعلقات کی نشان دہی کرتا ہے؛ عراق کا نیشنل میوزیم —— جو بابل و نینوا کے قدیم آثار کا امین ہے؛ اور ان سب کے علاوہ کتنے ہی بے نام نقوش تیزی سے تخیل کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔

آغازِ داستان

میں اور فخری ایک دوسرے کی طرف لپکے اور وسیع دو طرفہ سڑک کے درمیانی چبوترے پر اس طرح معانقہ کیا کہ عربی وضع کے مطابق بغل گیر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے رخساروں کا بوسہ بھی لے لیا۔ ہندستان میں یہ منظر ایک تماشا سا بن جاتا، لیکن وہاں کسی نے اس طرف توجہ بھی نہ کی۔

"تم یہاں کہاں؟" حیرت آمیز مسرت کے ساتھ میں نے سوال کیا۔

"عبداللہ ایک بات پر مجھ سے بگڑ گئے" فخری نے سنجیدگی سے جواب دیا "اور میں یہاں چلا آیا۔"

اس اتفاقی ملاقات سے کوئی چھ مہینے پہلے، اپریل ۱۹۴۵ء میں، بغداد پہنچنے کے چند ہی گھنٹے بعد، بغداد کے ریڈیو اسٹیشن پر فخری سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہیں سے روزانہ دوپہر اور سہ پہر کو ہندستانی فوجیوں کے لیے، جو عراق اور ایران کے کم تر آباد اور بیش تر غیر آباد مقامات پر تعینات تھے، انڈین آرمی پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ خبریں اور رنگ برنگ کے تفریحی پروگرام نشر کرتا تھا۔ اسی تعلق کی بنا پر بغداد کے دوران قیام میں تقریباً روزانہ ایک یا دو بار فخری سے ملاقات یا کم از کم علیک سلیک ضرور ہو جاتی۔ ہماری یہ ملاقاتیں جلد ہی دوستی اور بے تکلفی میں بدل گئیں۔

فخری کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ بس یہی تیس پینتیس سال کی رہی

ہوگی۔ ان کے باپ ترکی النسل عراقی اور ماں ایرانی النسل عراقی تھیں۔ فخری کے خدوخال میں ترکی جمال، عراقی سادگی اور ایرانی دل کشی کا بڑا دل کش امتزاج تھا۔ ان کی شخصیت کے ان ہی عناصر ثلاثہ نے مل جل کر بغداد کے سرکاری وغیر سرکاری حلقوں میں انھیں حد درجہ مقبول بنا دیا تھا۔ عراق کے نوعمر بادشاہ کے قایم مقام —— ریجنٹ —— عبداللہ سے ان کی خاصی یاد اللہ تھی۔ لیکن، اس کے باوجود، یہ سن کر مجھے قطعاً حیرت نہ ہوئی کہ کسی بات پر عبداللہ فخری سے بگڑ گئے اور انھیں قاہرہ میں پناہ لینی پڑی۔ شخصی نظام حکومت میں تو ایسی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ پھر فخری کے سیاسی خیالات سے بھی میں واقف تھا، جنھیں انتہا پسندانہ ہی کہا جا سکتا تھا، اس لیے مجھے اور بھی تعجب نہ ہوا۔ وہ بڑے درد کے ساتھ کہا کرتے تھے:

"مٹھی بھر شیوخ اس ملک پر قابض ہیں، جو گنتی میں ایک درجن سے زیادہ نہیں۔ وہی اس ملک کی قسمت کے مالک ہیں، وہی یہاں حکومتیں بناتے اور بگاڑتے ہیں۔"

"عالی شان عمارتوں کی بغل میں جھونپڑوں کی یہ قطاریں" دجلہ کے پل پر سے گزرتے ہوئے ایک بار میں نے فخری سے کہا "کتنا عجیب منظر ہے یہ!"

"لا انتہا دولت اور لا انتہا افلاس کا یہ تضاد" فخری نے جواب دیا "عراقی زندگی کے ہر موڑ پر تم کو کارفرما نظر آئے گا۔ ایک بات بتاؤں تم کو" فخری ہی نے کچھ رک کر کہا "یہ

منظر دیکھ کر مجھے بڑی طمانیت ہوتی ہے۔ یہ تضاد، جو روز بروز بڑھتا اور واضح تر ہوتا جا رہا ہے، خوش آیند مستقبل کا نقیب ہے۔ عرب ملکوں میں انقلاب عراق ہی سے شروع ہوگا۔"

کمیونسٹ ہو تم؟" میں نے سوال کیا۔

"کمیونسٹ تو میں نہیں ہوں" فخری نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا "لیکن میں انقلاب ضرور چاہتا ہوں، خواہ وہ کمیونسٹ انقلاب ہی کیوں نہ ہو۔ اور اب اس میں زیادہ دیر بھی نہیں ہے۔"

"تمھیں یقین ہے اس کا؟"

"قطعی یقین ہے۔ آج نہیں تو کل انقلاب ضرور آئے گا۔" پھر میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے فخری نے کہا "شہنشاہیت اور افلاس کے ناقابلِ برداشت دوہرے بوجھ کو کب تک ڈھوتے پھریں گے۔ ہم! اسے اتار پھینکنے کے لیے ہم بے تاب ہیں۔"

"ہندستان میں بھی ہم اسی ڈھنگ سے سوچتے ہیں" فخری کی باتیں سن کر میں نے کہا "کتنی مماثلت ہے ہندستان و عراق کے حالات میں۔"

"عراق و ہندستان ہی کے حالات میں مماثلت نہیں ہے" فخری نے جواب دیا "پورا مشرق ایک ہی کشتی میں سوار ہے، اور ایشیا و افریقہ کے تمام ملکوں کی قسمتیں ایک ہی ڈور سے

میں بندھی ہیں۔ یہ سب ماضی کا جو آثار پھینکنے پڑتے ہیں، اور یہ دن جلد ہی آنے والا ہے۔"

فخری کی باتیں سن کر فیضؔ کی نظم مجھے بے اختیار یاد آئی:

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز!

اس نظم کا مرکزی خیال میں نے بیان کیا تو فخری نے بھی اسی طرح کی ایک عربی نظم سنا دی جس میں عراق میں شہنشاہیت کے خاتمے کی بشارت اور جمہوریت کی آمد کی نوید سنائی گئی تھی۔

"تو اس نو عمر بادشاہ کو عراق پر حکومت کرنے کی تم لوگ زحمت نہ دو گے؟"

"نہیں" فخری نے سینہ تان کر جواب دیا "اس طرح کی حماقت کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"عام طور پر لوگ یہاں اسی طرح سوچتے ہیں؟"

"ہاں، بالکل اسی طرح سوچتے ہیں" فخری نے جواب دیا "لیکن کھلے بندوں اس کے اظہار کی ہمت ابھی ان میں نہیں پیدا ہوئی ہے۔ تمھیں شاید اس کا احساس نہ ہو، لیکن یہ حقیقت ہے، یہاں لوگ اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔ ہر طرف جاسوسوں کا دہرا جال بچھا ہے —— ایک شاہی محل کا اور دوسرا برطانوی سفارت خانے کا —— اور یہ سن کر شاید تمھیں تعجب ہوگا کہ شاہی محل کے عموماً اور برطانوی سفارت خانے کے خصوصاً سب سے بڑے اجنٹ ملا ہیں جو مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں اور

زیارت گاہوں میں پھیلے پڑے ہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عراق کی زندگی پر مذہب کی گرفت خاصی مضبوط ہے؟"

"ہاں ہے تو" فخری نے میرے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا "مگر دوسرے پس ماندہ ملکوں کی طرح عراق میں بھی مذہب کا اثر و نفوذ نچلے ہی طبقے تک محدود ہے ـــ جو اَن پڑھ ہے، جاہل ہے۔ برسرِ اقتدار شیوخ کے خاندان کو اور یہاں کے بالائی طبقے کو مذہب کے عملی پہلو سے دور دور کا بھی ربط نہیں ہے۔ یہ لوگ تو مذہب کو حصول مقصد کے لیے آلۂ کار بناتے ہیں ـــ تعلیم یافتہ نوجوان، خواہ کسی طبقے کے بھی ہوں، عموماً مذہب سے بے نیاز ہی نہیں بے زار بھی ہیں۔"

فخری کا تجزیہ، اپنے تجربے کی روشنی میں، مجھے حقیقت سے بہت قریب نظر آیا۔ میں بغداد ہی میں تھا کہ عید آئی۔ عید سے ایک دن پہلے بغداد ریڈیو اسٹیشن پر بغداد یونیورسٹی کے ایک نوجوان استاد سے ملاقات ہوئی، جو عیدالفطر کی سماجی اہمیت پر تقریر نشر کرنے آئے تھے۔ اسی موضوع پر باتیں کرتے ہوئے میں نے پوچھا:

"عید آپ کس طرح مناتے ہیں؟"

"ہر روز ہمارے یہاں عرق[1] کی ایک بوتل صرف ہوتی ہے"

---

[1]. ایک عراقی شراب جو جن اور ووڈکا کی طرح سفید ہوتی ہے۔

نوجوان پروفیسر نے جواب دیا "عید کے دن چار پانچ بوتلیں کھل جاتی ہیں۔"

اسی گفتگو کے دوران نوجوان عراقی نے کہا:

"ہمارا یہی دیس جو آج مجبور و محکوم ہے، انسانی تمدن کا اولین گہوارا رہا ہے۔ انسانی عشق و محبت کے ڈرامے کا پہلا اسٹیج ـــ باغ عدن ـــ بھی یہیں تھا، اور آدم و حوا نے اپنی نسل کی تخم ریزی بھی یہیں سے شروع کی تھی۔ دنیا کی اولین جمہوریت نے بھی، کوئی دو ڈھائی ہزار برس قبل، اسی دیار میں جنم لیا تھا۔ ہمارا کلچر دیکھنا ہو تو بابل و نینوا کے کھنڈروں کو دیکھو۔"

بصرے سے بغداد تک

وسط اپریل ۱۹۴۵ء میں بغداد جانے کے لیے بصرے پہنچا تو ہندستانی فوجی وہاں بڑی کثرت سے نظر آئے۔ ہندستان کے برعکس انگریز کم اور امریکن تو سرے سے تھے ہی نہیں۔ بازار میں عراقی کرنسی کے ساتھ ساتھ ہندستانی کرنسی بھی چلتی تھی۔ یہی حال ہندستانی بولی کا بھی تھا۔ عام طور پر لوگ اچھی خاصی انگریزی اور ٹوٹی پھوٹی ہندستانی بول لیتے تھے۔

بصرے سے بغداد کا سفر، ایکسپریس ٹرین سے، ایک رات کا تھا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے پہلے یہ ریلوے لائن بین الاقوامی اہمیت کی حامل تھی، جو خشکی کی راہ سے مشرق کا ناتا مغرب سے جوڑتی تھی۔ اس کا سلسلہ عراق، شام اور ترکی ہوتا ہوا برلن تک چلا جاتا تھا اور 'بی بی اکسپریس' (برلن بغداد اکسپریس) اسی لائن پر دوڑا کرتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل قیصر نے 'جرمن امپائر' کا جو خواب دیکھا تھا، اسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے

یہ ریلوے لائن بچھانی شروع کی گئی تھی، اور اس کی تکمیل ہٹلر کے عہد میں ہوئی۔

بصرہ ریلوے اسٹیشن پر یہ دیکھ کر اور زیادہ حیرانی ہوئی کہ ریل کا عملہ ہی نہیں، ریل کے ڈبے بھی ہندستانی تھے۔ پلیٹ فارم پر ہر طرف ہندستانی نوجوان نظر آتے تھے۔ عراقی خال خال ہی تھے۔ گاڑی چھوٹنے سے کچھ پہلے ایک صاحب اور میرے کمپارٹمنٹ میں ہانپتے کانپتے داخل ہوئے اور سامنے کی برتھ پر اپنا کٹ بیگ نما مختصر سا ہولڈ آل پھینکنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے:

"میرا نام ڈاکٹر راجن ہے" بڑی بے تکلفی سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے انھوں نے کہا "اور میں بھی بغداد جا رہا ہوں۔"

ان کے اس بے تکلفی کے انداز میں بڑی دل کشی تھی۔ کٹ بیگ پر جلی حرفوں میں ان کا پورا نام "کیپٹن ڈاکٹر راجندر سنگھ" اور نام کے نیچے نسبتاً خفی حرفوں میں "اینٹی ملیریا یونٹ بغداد" لکھا تھا۔

"آپ کا تعلق تو شاہی محکمے سے ہے" تفصیلی تعارف کے بعد انھوں نے کہا "ہر جگہ آپ کی بڑی مان دان ہوگی۔"

"ہندستان میں تو ہمیں کوئی گھاس بھی نہیں ڈالتا۔"

"وہاں کی اور بات ہے" ڈاکٹر راجن نے ہنس کر کہا "یہاں تو لوگ آپ کے آگے دودھ ملیدہ ڈالیں گے۔ آپ کے

ریڈیو پروگرام کی بڑی اہمیت اور قدر ہے۔"
ڈاکٹر راجن نے بتلایا کہ ان کی فوجی ملازمت کی عمر تو زیادہ نہیں ہے۔ ہندستان سے نکلے ہوئے ابھی انھیں دو ہی برس ہوئے ہیں، لیکن اس مختصر سے عرصے میں انھوں نے اٹلی، مصر، ایران و عراق کی سیر کر لی ہے۔

"اس جنگ نے ہندستانی جوانوں کے ذہنوں کو نئے سانچے میں ڈھالا ہے" ڈاکٹر راجن نے اپنے دو سالہ تجربات بیان کرتے ہوئے کہا "اب ان کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ رہی ہے۔ انھیں اس کا بھی پورا پورا احساس ہے کہ اتحادی قوتوں کی کامیابی میں ان کا بھی بہت بڑا حصّہ ہے۔ افریقہ کے جلجلاتے ریگستانوں میں رومیل کے بڑھتے ہوئے طوفان کو حقیقتاً ہندستانی ہی فوج نے پسپا کیا۔ دوسری طرف یورپ، افریقہ اور ایشیا کے آزاد و نیم آزاد ملکوں کے تجربات نے ہندستانی جوانوں کے دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ فرانس، اٹلی اور یورپ کے بعض ملکوں میں، جہاں اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا ہے، ہندستانی جوانوں کو نسبتاً زیادہ پسند کیا جاتا ہے، جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہندستانی فوجیوں کا رویہ ان ملکوں کے عوام کے ساتھ شریفانہ اور ہمدردانہ رہا ہے۔ وہاں کی عورتیں انگریزوں، اور امریکنوں کے بھی، مقابلے میں ہندستانیوں کی طرف زیادہ ملتفت ہوتی ہیں۔ بہت سے ہندستانی فوجیوں نے ان ملکوں کی عورتوں

کے ساتھ شادیاں بھی کی ہیں۔ ان حالات نے ہندستانی اور انگریز فوجیوں کے تعلقات مرنے مارنے کی حد تک کشیدہ کر دیے ہیں۔

"ابھی کچھ ہی دن پہلے" ڈاکٹر راجن نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بتلایا "سر سکندر حیات اور بیگم شاہنواز نے اُن ملکوں کا دورہ کیا تھا، جہاں ہندستانی فوجیں تعینات ہیں۔ جوانوں نے ہر جگہ ان دونوں سے تندی و ترشی سے باتیں کیں۔ یہاں عراق میں بھی پنجابی جوانوں نے سر سکندر سے بڑے ٹیڑھے سوالات کیے"

"یہ ذہن" ڈاکٹر راجن نے مسرت کے ساتھ کہا "صرف ان جوانوں ہی تک محدود نہیں ہے، جو تازہ تازہ اسکولوں اور کالجوں سے نکل کر فوج میں بھرتی ہوئے ہیں، جو شہروں میں انقلاب زندہ باد کی فضا میں پلے اور بڑھے ہیں، اس جنگ نے تو روایتی سپاہیوں کے سوچنے کا ڈھنگ بھی بدل دیا ہے، جو اصولی طور پر سیاست سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ یہ ڈھکی چھپی باتیں نہیں ہیں۔ مقامی برطانوی فوجی افسر، بلکہ دلّی سے لندن تک تمام متعلقہ افراد بھی، ان حالات سے ہم سے زیادہ واقف ہیں۔

"آپ تو ایسے وقت میں آئے ہیں" کچھ رک کر کیپٹن راجن نے کہا "جب لڑائی ختم ہی ہے۔ اٹلی اور جرمنی کی کمر تو ٹوٹ ہی چکی ہے، اور جاپان صرف ہری کاری کی روایتی

ہمت کے بل پر میدان میں اڑا ہے۔ ورنہ اب دم اس میں بھی نہیں ہے۔ [1]"

صبح کو آنکھ کھلی تو گاڑی ایک اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ بہت سے عراقی بچے، بوڑھے، اور کچھ جوان بھی میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے، ہاتھوں میں مٹی کے پیالے لیے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ ان پیالوں میں جما ہوا دہی تھا، جس کی لذت آج بھی مجھے یاد ہے۔ کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا تو مختصر سی عمارت پر عربی اور انگریزی کے موٹے موٹے حرفوں میں اسٹیشن کا نام لکھا تھا۔

"ارے!" میں نے حیرت سے کہا "ڈاکٹر راجن اسی اسٹیشن کا نام ہندہ ہے!"

"ہند آپ کا پیچھا کہیں نہ چھوڑے گا۔" انھوں نے جواب دیا "جگر نے ہندستان ہی کے لیے کہا ہے:

"جہاں جایئے گا ہمیں پایئے گا"

ہندہ سے بغداد کا سفر کوئی چار گھنٹے کا تھا۔ راستے میں جو گاؤں نظر آئے، انھیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ عراق اور ہندستان کی عام زندگی ایک دوسرے سے بہت قریب ہے۔ مکانات عام طور پر کچے اور جھونپڑی نما تھے، بالکل ویسے ہی جیسے ہندستان کے کسی بھی گاؤں کے ہو سکتے ہیں۔

---

[1] اس گفتگو کے ڈھائی تین مہینے بعد، ۸ مئی ۱۹۴۵ء کو، یورپ میں جنگ کا باضابطہ خاتمہ ہو گیا۔

"یہاں کے گاؤں بھی ہندستان کی یاد دلاتے ہیں" میں نے ڈاکٹر راجن سے کہا۔

"گاؤں ہی نہیں" انھوں نے جواب دیا "یہاں کے شہر بھی آپ کو ہندستان کی یاد دلائیں گے۔ گندگی وغلاظت اور افلاس و جہالت جو ہندستان میں عام ہے، یہاں اور زیادہ بھیانک روپ میں آپ کو نظر آئے گی۔"

بغداد میں ہمارا دفتر شہر کے ایک ایسے علاقے میں تھا، جہاں سے جدید بغداد کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔ اسی کے قریب ریڈیو اسٹیشن تھا، جس سے ہمیں روزانہ دو بار سابقہ پڑتا تھا۔ اسی سڑک پر کچھ آگے بڑھ کر جرمن سفارت خانے کی مہیب اور پر اسرار سی عمارت تھی، جس میں اب روسی سفارت خانہ تھا۔ اس کے بعد آبادی کا سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔ پھر بہت دور آگے چل کر اسی سڑک پر "شاہی محل" تھا، جس کے گرد مسلح سپاہی پہرہ دیا کرتے تھے۔

ہمارے دفتر کے قریب ہی شاہ فیصل کا اسٹیچو دجلہ کے پہلے پل کے سر پر ہے۔ یہی شاہ فیصل جدید عراق کے بانی اور معمار تھے۔ ان کے باپ شریف حسین نے، جو شریف مکہ بھی تھے، پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد جب ترکوں کی عثمانی حکومت کا خاتمہ ہوا، تو شریف حسین کی خدمات کے صلے میں اردن کی حکومت ان کے ایک بیٹے کو اور عراق کی سلطنت دوسرے کو ملی۔ شاہ فیصل کے اسٹیچو کے قریب سے گزر کر

اور دجلہ کا پل پار کر کے ہم شارع الرشید میں داخل ہو جاتے تھے، جو شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی جاتی ہے — شارع الرشید میں داخل ہونے کے بعد آپ اگر مغرب کی طرف گھومیں تو اس کا سلسلہ جامع امام الاعظم تک چلا جائے گا۔ وہیں سے یہ سڑک کاظمین کی طرف گھوم جاتی ہے۔

ہمارا دفتر گیارہ بارہ افراد پر مشتمل تھا۔ اس کے انچارج میجر عارف تھے، جو خالص پنجابی ہونے کے باوجود غیر پنجابی لہجے میں اردو بولتے۔ ان کی گفتگو بہت دل چسپ ہوتی تھی۔ باتیں بہت قوم پرورانہ کیا کرتے تھے۔

بغداد اور اس کے نواح میں' بصرے ہی کی طرح' ہندستانی فوجیوں کی کثرت تھی۔ ایران اور عراق کے محاذ کے مرکزی دفتر بغداد ہی میں تھے' جہاں ہندستانی جوان اور افسر خاصی تعداد میں تھے۔ کچھ غیر فوجی ہندستانی بھی بغداد میں تھے' جو یا تو برطانوی سفارت خانے میں ہندستانی قونسل کے دفتر سے وابستہ تھے یا تجارت پیشہ تھے۔ بغداد کے واحد انگریزی اخبار عراق ٹائمز کے ادارتی شعبے میں ایک نوجوان مدراسی' مسٹر نرائنن اور پریس میں چار پانچ ہندستانی کمپوزیٹر اور پریس مین تھے۔ ان سب ہندستانیوں سے عموماً اور عراق ٹائمز کے پریس میں کام کرنے والوں سے خصوصاً ہمارا ربط ضبط تھا، جس کی وجہ ایک یہ تھی کہ رومن رسم خط کا ہمارا ہفتہ وار اخبار 'وطن' عراق ٹائمز ہی کے پریس میں چھپتا تھا۔

'وطن' آٹھ صفحے کا ہفتہ وار اخبار تھا۔ اداریہ اور ادارتی

نوٹ اس میں بالکل نہیں ہوتے تھے۔ صرف خبریں ہوتی تھیں — بیشتر جوانوں کے کھیل کود کے مقابلوں اور تفریحی مشاغل کی، یا ان کی عام دل چسپی کی۔ تھوڑی بہت وطن کی غیر سیاسی خبریں بھی دی جاتی تھیں، اور اسی کے بہانے ہندستان کے چار پانچ انگریزی روزنامے پابندی سے آتے تھے۔ یہ روز کے روز نہیں بلکہ دوسرے تیسرے دن ہوائی جہاز سے، ڈھیر کے ڈھیر آجاتے۔

جوانوں کے مشاغل کی خبریں فراہم کرنے کے لیے نزدیک اور دور کے فوجی کیمپوں کے ہم دورے کرتے۔ ایسے جوانوں کی بھی ہمیں تلاش رہتی جو ہمارے ریڈیو پروگرام میں حصّہ لے سکیں۔ ان ہی سب باتوں نے مل ملاکر ہمارے محکمے کو جوانوں میں مقبول بنادیا تھا، جس کی طرف ڈاکٹر راجن نے اشارہ کیا تھا۔ اسی بنا پر ہر جگہ ہماری خاطر مدارات بھی ہوتی تھی۔

بغداد میں مقیم ہندستانیوں کی ایک انجمن — انڈین اسوسیشن بھی تھی، جو عید، بقرعید، ہولی، دیوالی، بیساکھی اور کرسمس کے موقعوں پر اپنے ہم وطن ہندستانی فوجیوں کو دعوتیں دیتی۔ اسی طرح ہندستانی فوجی کیمپوں میں جب کوئی تقریب ہوتی، یا ناچنے گانے والی کوئی پارٹی ہندستان سے آتی، تو بغداد کے ہندستانی شہریوں کو بھی مدعو کیا جاتا۔

شملہ کانفرنس

بغداد پہنچنے کے بعد فوجی زندگی کے جو رموز منکشف ہوئے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ دوران جنگ کی فوجی زندگی میں سنیچر کی رات کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے ــــ خصوصاً ان فوجیوں کے لیے جو وطن سے دور اور شہری زندگی کی مسرتوں سے محروم ہوتے ہیں۔ ان راتوں کو کبھی چھوٹے اور کبھی بڑے پیمانے پر محفلیں گرم ہوتی ہیں، جن میں جوان اور افسر دونوں شریک ہوتے ہیں۔ ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں۔ ناچ گانا بھی ہوتا ہے۔

اسی طرح کی ایک رات ــــ ۱۶ر جون ۱۹۴۵ء کی رات کو ــــ ڈاکٹر راجن اور ہم دونوں کے ایک مشترک دوست، لفٹیننٹ حسین کھانے پینے کا بہت سا سامان لے کر، بلا اطلاع، ہمارے یہاں آ دھمکے۔ میں تو اس وقت وہاں تھا نہیں، لیکن میرے ایک رفیق لفٹیننٹ ملک موجود تھے، جو اس 'فتوح' کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے، اور کچھ دوستوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، جو اس میں

حقہ لگا سکیں۔

راجن اور حسین نے پلنگ اور کرسیاں ایک طرف کر کے کمرے میں زمین پر دریاں اور گدے بچھائے۔ پھر ہمارے بکسوں سے صاف چادریں نکال کر لگائیں اور کھانے پینے کا سامان قرینے سے چن دیا۔

راجن اور حسین اودھ کے ایک ہی قصبے کے رہنے والے تھے۔ ہم وطن ہونے کے علاوہ دونوں بچپن کے دوست بھی تھے، اور ان کی یہ دوستی نئی نہیں، پشتینی تھی۔ ڈاکٹر راجن نیم کمیونسٹ نیم کانگرسی، اور حسین نیم کمیونسٹ نیم مسلم لیگی تھے۔ ان دونوں میں خوب بحثیں ہوتیں، لیکن سیاسی و نظریاتی اختلافات کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے بڑے مخلص اور جاں نثار دوست بھی تھے۔ میں پہنچا تو یہ دونوں اپنا 'کاروبار شوق' شروع کر چکے تھے۔

"یہ کیا؟" میں نے اس اہتمام کو دیکھ کر سوال کیا۔

"خانۂ خالی را دیو می گیرد" حسین نے جواب دیا۔ پھر کھانے پینے کے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم بھی کیا یاد کروگے کہ اودھ کے کسی رئیس سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"اپنی آزادی کا استقبال کرنے کے لیے ہم تمھارے یہاں آئے ہیں" ڈاکٹر راجن نے اضافہ کیا۔

"آزادی ؟" راجن کو چھیڑنے کے لیے میں نے کہا "دلّی ہنوز دور است۔"

"نہیں نہیں!" حسین نے سرخوشی کے عالم میں انگلی اٹھا کر

اشارہ کیا "وہ دیکھو! وہ دیکھو! ہماری آزادی جھانک رہی ہے، دور کھڑی جھانک رہی ہے۔"

"جھانک نہیں رہی ہے" راجن نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا "آ رہی ہے، چھم چھم کرتی ہوئی آ رہی ہے" اور تھرک تھرک کر گانا شروع کیا:

کوئی آتش در سبو، شعلہ بجام آ ہی گیا
آفتاب آ ہی گیا، ماہِ تمام آ ہی گیا

راجن اور حسین کی باتوں کا پس منظر یہ تھا کہ دو روز قبل وزیر ہند مسٹر ایمری نے برطانوی پارلیمنٹ میں اعلان کیا تھا کہ کانگرس اور مسلم لیگ اگر متفق ہو جائیں تو برطانوی حکومت مرکز میں ان کی ملی جلی حکومت بنانے دے گی۔ اس اعلان کے دوسرے ہی دن —— اس رات سے ایک دن قبل —— کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہا کر دیے گئے تھے، اور وائسرائے لارڈ ویول نے شملہ میں ہندستانی لیڈروں کی کانفرنس بلانے کا اعلان کیا تھا۔ ان اعلانات کی نیز ہندستان کی سیاسی فضا کی روشنی میں شملہ کانفرنس کی کامیابی کے امکانات کا ہم جائزہ لے ہی رہے تھے کہ ملک صاحب عراق ٹائمز کے اسسٹنٹ اڈیٹر نرائنن کو لیے ہوئے داخل ہوئے۔

"تازہ ترین خبر یہ ہے" صاحب سلامت کے بعد نرائنن نے جوتے کی ڈوری کھولتے ہوئے کہا "یقین ہے کہ شملہ کانفرنس سے پہلے کانگرس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوگا۔"

"شملہ ہی میں ہوگا؟" راجن نے سوال کیا۔
"نہیں شاید بمبئی میں" نرائنن نے جواب دیا۔
"گویا کانگرس وہیں سے شروع کرنا چاہتی ہے" راجن نے کہا "جہاں سے ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو اسے ختم کرنا پڑا تھا!"
"تمھارا یہ خیال اگر صحیح نکلا" حسین نے رک رک کر کہا "تو یہ شگون نیک نہیں ہے۔"
"کیا مطلب؟" راجن نے کچھ ترش سے لہجے میں سوال کیا۔
"میاں صاحبزادے! اگست ۴۲ ۱۹ء اور جون ۱۹۴۵ء میں زمین آسمان کا فرق ہے" حسین نے بھی ترشی کے ساتھ جواب دیا "۱۹۴۲ء میں لڑائی اپنے انتہائی خطرناک دور سے گزر رہی تھی، اس وقت اتحادیوں کو ہمارے تعاون کی شدید ضرورت تھی۔ آج جب کہ اتحادی بڑی حد تک لڑائی جیت چکے ہیں، انھیں ہماری کوئی پروا نہیں ہو سکتی۔ سمجھے آپ! کانگرس نے اگر حقیقت پسندی سے کام نہ لیا تو شملہ کانفرنس کا، اور اس کے ساتھ ہی پورے ملک کا بیڑہ غرق ہو جائے گا۔"
"حقیقت پسندی سے کام لینا تو کانگرس ہی کا فرض ہے" راجن نے جواب دیا "اور مسلم لیگ کو تو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"
"مسلم لیگ اور حقیقت پسندی میں باپ مارے کا بیر ہے" ملک صاحب نے کہا۔
"اور حسین صاحب!" میں نے کہا "شملہ کانفرنس سے شاید

آپ کو بڑی امیدیں ہیں"۔
"نہیں، شملہ کانفرنس سے مجھے بہت زیادہ امید نہیں ہے" حسین نے جواب دیا "لیکن میرا گمان ہے کہ انگریز ہمارے مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہے۔ شملہ کانفرنس اگر ناکام ہوئی تو اس کی ذمے داری انگریز پر نہیں ہمارے لیڈروں پر ہوگی۔ خواہ وہ کانگریس کے ہوں یا مسلم لیگ کے"۔
"شملہ کانفرنس تو چرچل کی انتخابی چال ہے" نرائنن نے اپنا خیال ظاہر کیا "برطانیہ کے عوام ہندستان کو آزادی دینے کے حق میں ہیں، ان کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے چرچل نے یہ چال چلی ہے"۔
"برطانیہ کے انتخابات کے ساتھ ساتھ" راجن نے اضافہ کیا "اگلے ہی مہینے پوسٹڈم کانفرنس بھی ہو رہی ہے۔ چرچل کو پریسیڈنٹ روزولٹ اور کامریڈ اسٹالن کو بھی منہ دکھانا ہے"۔
"اسے کہتے ہیں ایک تیر سے دو شکار" ملک صاحب نے لال بھکڑ کی طرح سر ہلا کر کہا "واللہ! انگریز کا بھی جواب نہیں ہے"۔
"شملہ کانفرنس سے کہیں زیادہ برطانیہ کے انتخابات پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے" راجن نے پھر کہا "لیبر پارٹی آگئی تو ہندستان کی آزادی یقینی ہے، اور اگر کنزرویٹو آئے تو ہمارا معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ جائے گا"۔
"مجھے تو شملہ کانفرنس اور برطانیہ کے انتخابات دونوں سے کوئی امید نہیں" میں نے کہا "آپ لوگوں کی خوش فہمیاں سن کر

مجھے اپنے ایک استاد کی بات یاد آگئی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہر سگریٹ کا مزہ اور ہر انگریز کی صورت مجھے ایک سی معلوم ہوتی ہے۔"

"اس بیان میں بڑی صداقت ہے" راجن نے میری تائید کی "ہندستان کا جہاں تک تعلق ہے لیبر اور کنزرویٹو میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ ایک گڑ دے کر مارنا چاہتا ہے اور دوسرا زہر دے کر۔"

"ہمارے لیے یقیناً دونوں یک ساں ہیں" میں نے اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "ہمیں آزادی نہ یہ دیں گے، اور نہ وہ، آزادی تو ہمیں لینی ہوگی۔"

"شملہ کانفرنس میں تو بہرحال کچھ نہیں ہونا ہے" نرائن نے ہندستانی سیاست کے ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کیا "انگریزوں کی نیت سے قطع نظر وہاں بھی وہی جناح اور گاندھی ہوں گے، جو پچھلے سال اٹھارہ دن تک مسلسل بات چیت کرنے کے بعد بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے[1]۔ ان دونوں گجراتیوں نے تو شاید آپس میں سمجھوتہ کرلیا ہے کہ کسی بات پر وہ متفق نہیں ہوں گے۔"

"تم سچ کہتے ہو" ملک نے نرائن کے جملے کی داد دیتے ہوئے

---

[1] ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء سے ۲۷ ستمبر ۱۹۴۴ء تک بمبئی میں گاندھی جی اور مسٹر جناح کی گفتگو ہوئی تھی، جس کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا تھا۔

کہا" میرا تو جی چاہتا ہے کہ گاندھی جی اور جناح دونوں شملہ نہ جائیں اور یہ جناح تو....."

"بس! بس! زبان سنبھال کر بات کرو، اور جناح نہیں قائد اعظم کہو" حسین نے ملک کو ڈانٹتے ہوئے کہا" تمھارے گاندھی جی انھیں قائد اعظم ہی کہتے ہیں"۔

"گاندھی جی غلط کرتے ہیں" راجن نے بپھر کر کہا "خرابی کی جڑ تو گاندھی جی ہی ہیں، ان ہی نے تو جناح کا دماغ خراب کیا ہے"۔

"مارو گولی ان دونوں کو" ملک کو جوش آگیا "دونوں کو شملہ نہ جانا چاہیے۔ کل رات مجھے لفٹننٹ کباڈیا مل گیا تھا میس میں، دھت تھا نشے میں۔ ان دونوں کو بڑی موٹی موٹی گالیاں دے رہا تھا۔ کہتا تھا کہ ایک ہندستانی بورژواجی کا اجنٹ ہے اور دوسرا برٹش سام راج کا"۔

"وہ تو سالا کمیونسٹ ہے" نرائنن نے کہا "پوچھا نہیں تم نے کہ اس کے گرو پی سی جوشی کس کے ایجنٹ ہیں۔ آج کل تو جناح اور چرچل دونوں سے خوب گھٹ رہی ہے"۔

بحث کا یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ جوں جوں رات بھیگتی گئی، لوگوں کا جوش بھی بڑھتا رہا۔ پھر سب باتیں کرتے کرتے اور سنتے سنتے ایک ایک کر کے وہیں دراز ہو گئے۔

اس دعوت کے چند ہی روز بعد ہمارے قاہرہ کے مرکزی دفتر

نے اطلاع دی کہ مجھے فوری طور پر تہران جانا ہے۔ بغداد ریلوے اسٹیشن پر جو دوست خدا حافظ کہنے آئے، ان میں نرائنن بھی تھے۔

"۱۶ر جون کی رات کی ساری باتیں تو شاید تمھیں یاد نہ ہوں" گاڑی چھوٹنے سے کچھ پہلے نرائنن نے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا "لیکن میں تمھارا رونا اور تمھاری ایک بات کبھی بھول نہیں سکتا۔"

"کون سی بات؟" میں نے سوال کیا۔

"اب اس کی تفصیل بیان کرنے کا وقت نہیں ہے" نرائنن نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "بہرکیف میں تمھارے اس بے رحمانہ خیال سے آج بھی اتفاق نہیں کر سکتا کہ یہ ہندستانی سپاہی جو آج باہم شیر و شکر ہیں، وطن کی دھرتی پر قدم رکھتے ہی آپس میں کتوں کی طرح لڑنے لگیں گے۔"

"میں نے جو کچھ کہا تھا" میں نے جواب دیا "آج بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے اور اس وقت بھی میرا یہی گمان ہے۔ خدا کرے یہ غلط نکلے۔"

رات بصرے میں گزار کر، دوسرے دن صبح دس بجے، اہواز کی طرف روانہ ہوا، جہاں سے تہران کے لیے "راہِ آہن" (ریل) کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس سفر کے لیے خوش قسمتی سے ایک اسٹیشن ویگن مل گئی، جو اہواز ہی جا رہی تھی۔

عشار سے گزرتے ہوئے، جو بصرہ ہی کا حصہ ہے، عراق

ڈیٹس کمپنی کی شاندار دکان نظر آئی۔ کھجور ہی عراق کی سب سے بڑی پیداوار ہے، جو اپنی لذت اور غذائی توانائی کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہی عراقیوں کی اصلی غذا اور عراق کی حقیقی دولت ہے۔ دجلہ و فرات کے کنارے کنارے کھجور کے درختوں کے لاتعداد جھنڈ نظر آتے ہیں، جن کے پھل عراقیوں کا پیٹ پالنے کے علاوہ دنیا کے سارے ملکوں کو بھیجے جاتے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق عراق میں ساڑھے تین کروڑ کھجور کے درخت ہیں۔

عراق ڈیٹس کمپنی کی یہ دکان اسی قسم کی تھی، جیسی کلکتے یا بمبئی کی بڑی بڑی دکانیں ہوتی ہیں۔ سامنے کاؤنٹر پر ایک مدراسی سیلس مین کھڑا تھا۔ اسی کے مشورے سے کھجوروں کے کئی چھوٹے بڑے ڈبے خریدے۔ جیب سے بٹوہ نکالا جس میں چوتھائی عراقی دینار[1] کے سوئے نئے نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ چھ نوٹ نکال کر سیلس مین کو دیے۔ کچھ دیر اس سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے کچھ رقم واپس کی اور اس کا شکریہ ادا کرکے میں چل پڑا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد یاد آیا کہ بٹوہ کاؤنٹر ہی پر بھول آیا ہوں۔ واپس آیا تو وہ اسی جگہ رکھا تھا، جہاں چھوڑا تھا۔ سیلس مین جو اپنی جگہ پر بدستور کھڑا تھا، اس کا مزید شکریہ ادا کرکے بٹوہ جیب میں ڈال لیا۔

---

[1] عراقی دینار برطانوی پاؤنڈ کے برابر ہوتا تھا، جس کی قیمت اس وقت تیرہ روپے پانچ آنے ہوتی تھی۔

پچیس تیس میل جانے کے بعد ایک چائے خانے میں، جو سڑک کے کنارے ایک خیمے میں تھا، ہم نے چائے پی۔ قیمت ادا کرنے کے لیے بٹوے سے ایک اور نوٹ نکالا۔ اتفاقاً اس کے نمبر پر نظر پڑی تو پتا چلا یہ بیسواں نوٹ ہے۔ اگرچہ اب تک میں نے اس میں سے صرف سات ہی نوٹ نکالے تھے۔ اس حساب سے تیرہ نوٹ اس میں سے غائب تھے۔ ڈرائیور کا اصرار تھا کہ واپس لوٹ کر یہ رقم ہدر اسی سے وصول کی جائے، لیکن اس صورت میں وقت پر اہواز پہنچنا ناممکن ہو جاتا، اور گاڑی چھوٹ جانے کی صورت میں کئی دن تک اہواز ہی میں پڑا رہنا پڑتا۔

جنگ نے نوجیوں کے لیے بین الاقوامی سرحدی ضابطوں کی پابندیاں اس طرح ختم کی تھیں کہ اس کا احساس ہی نہ ہو سکا کہ عراق کی سرحد کس جگہ ختم ہوئی اور کہاں سے ایران کی سرحد شروع ہو گئی۔ ایران کے مشہور صنعتی شہر آبادان کے قریب پہنچنے کے بعد ہی اندازہ ہو سکا کہ ارضِ لیلیٰ سے نکل کر ہم دیارِ شیریں میں داخل ہو چکے ہیں۔

آباداں سے تہران تک

آبادان، تیل کا شہر، عراق کی سرحد سے متصل، خلیج فارس کے دہانے پر، مشرق کا اہم ترین صنعتی شہر ہے۔ 'نفت' (تیل) — ایران کی دولتِ سیال — ایران کی دھرتی کا جگر چیر کر نکالا جاتا ہے اور پائپ لائنوں کے ذریعے، جس کا جال پورے جنوبی ایران میں پھیلا ہے، آبادان لایا جاتا ہے۔

آبادان کی ساری آبادی تیل صاف کرنے کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں، کلرکوں، افسروں اور انجینیروں پر مشتمل ہے۔ ان کے رہایشی مکانوں کے علاوہ کلب اور تفریح گاہیں بھی ہیں۔ یہاں کی آبادی کا بڑا حصہ ہندستانیوں پر مشتمل نظر آیا۔

دو گھنٹے تک شہر کا گشت لگانے کے بعد اگلی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ ٹھیک پانچ بجے اہواز ریلوے اسٹیشن پہنچا، جسے سرکاری طور پر "ایستگاہِ راہِ آہن" اور عام بول چال میں 'اِستاسیوُن' کہتے ہیں، جو فرانسیسی زبان سے مستعار لیا گیا ہے۔

اہواز چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں بلا کی گرمی ہوتی ہے۔ تہران جانے کے لیے یہیں سے ریل کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اسٹیشن پر برطانوی، امریکی اور ہندستانی فوجیوں کا ہجوم تھا۔ مگر ایرانی خال خال ہی نظر آئے۔ ریلوے کے برطانوی عملے کی مدد سے اپنے کمپارٹ منٹ تک پہنچا، جو چار برتھ کا تھا۔ میرے حصے میں نیچے کی برتھ آئی تھی۔ باقی کسی ایرانی آقائے جعفر زادہ کی تھیں، جن کا نام اس کاغذ پر لکھا تھا، جو درجے کے باہر چسپاں تھا۔

یہ کاریڈور ٹرین تھی، جس میں اندر ہی اندر ایک سرے سے دوسرے سرے تک جایا جا سکتا تھا۔ اپنا مختصر سامان برتھ کے نیچے رکھنے اور بستر لگانے کے بعد ایک ایرانی رستوران میں چائے پینے میں چلا گیا، جو میرے ڈبے کے سامنے ہی تھا۔ ایران میں ضروریات زندگی کی نایابی اور گرانی کا پہلا تجربہ اسی رستوران میں ہوا۔ میرے ہاتھ میں ایک سولا ہیٹ تھا، جو دہلی سے پانچ یا چھ روپے کا خریدا تھا۔ استعمال کی نوبت بہت کم آئی تھی، اس لیے نیا معلوم ہو رہا تھا۔ رستوران کے نوجوان منیجر نے ہیٹ کو الٹ پلٹ کر للچائی ہوئی نظر دل سے دیکھا۔ جب میں چلنے لگا تو اس نے ایرانی لہجے میں، بڑی بے تکلفی سے ہندستانی میں پوچھا:

"بیچو گے؟"

"کیا دو گے؟" میں نے بھی بے تکلفی سے سوال کیا۔

"تیس تومان[1]۔"

---

[1] تومان دس ریال کا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اس کی قیمت ایک روپے کے برابر ہوتی تھی۔

"لاؤ" اس کے جواب کو مذاق پر محمول کر کے میں نے کہا۔

"یہ لو" کیش بکس سے میلے میلے ایرانی نوٹ نکال کر اس نے میرے آگے بڑھا دیے۔

"اچھا یہ تمھاری نذر ہے" ہیٹ کو اس کے سر پر رکھتے ہوئے میں نے کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا" قیمت لینے پر اس نے اصرار کیا اور ہیٹ کو اتار کر اس نے ایک بار پھر غور سے دیکھا، جیسے سوچ رہا ہو کہ سودا برا تو نہیں ہے۔

کسی دوسرے گاہک نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا، اور میں خاموشی سے اپنے کمپارٹ منٹ میں آ گیا۔ سامنے کی برتھ پر ادھیڑ عمر کے ایک ایرانی بزرگ سگار پی رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک خاتون بیٹھی کوئی فرانسیسی اخبار پڑھ رہی تھیں، جس سے ان کا پورا چہرہ چھپا تھا۔

"آپ غالباً آقائے جعفر زادہ ہیں" اپنا تعارف کراتے ہوئے میں نے انگریزی میں کہا۔

"بلے" سر کو ہلکی سی جنبش دے کر انھوں نے جواب دیا، اور کھڑے ہو کر گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "خیلے خوش وقت شدیم۔"

آقائے جعفر زادہ کی بات تو میں نے سمجھ لی، لیکن اس کا جواب فارسی میں نہ دے سکا۔ خاتون نے بھی اب اپنے چہرے سے اخبار ہٹا کر زانو پر رکھا۔ ایک اچٹتی ہوئی نظر میں نے ان پر ڈالی۔ اس سے زیادہ نہ تو مناسب تھا، اور نہ شاید ممکن۔ گفتگو میں پہل خاتون

ہی نے کی۔ ان کو گمان ہوا کہ میں فارسی میں بالکل ہی کورا ہوں، اور آقائے جعفر زادہ کی بات میرے پلّے نہیں پڑی ہے۔ اسی لیے انھوں نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتلایا کہ "ہاں یہی آقائے جعفر زادہ ہیں۔ یہ انگریزی نہیں جانتے۔ تم فارسی بالکل نہیں بولتے۔"

"بہ فارسی قدرے بلد ہستم" جھجکتے ہوئے میں نے جواب دیا۔ پھر انگریزی میں رک رک کر میں نے کہا "فارسی تھوڑی بہت سمجھ لیتا ہوں، لیکن بول نہیں سکتا۔ میری طرف سے آقائے جعفر زادہ سے آپ کہیے کہ ایک رات اور آدھے دن کا یہ سفر کیسے کٹے گا!

"زبان ہم سفر ترکی و من ترکی نمی دانم"

"فارسی تو تمھیں خوب آتی ہے" دونوں نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔ پھر میری بات کا اُلٹا سیدھا انگریزی ترجمہ خاتون نے آقائے جعفر زادہ کو سنایا۔

"ان سے کہو" انھوں نے جواب دیا "میری بیٹی تو انگریزی کم ہی جانتی ہے، مگر میرا بیٹا جو ابھی باہر ہے، انگریزی خوب بولتا ہے۔ اور رات بھر میں ہم تمھیں فارسی بولنا سکھا دیں گے۔ صبح کو تم فارسی بولتے اٹھو گے۔"

"آپ کا نام؟" اپنا نام بتانے کے بعد خاتون سے میں نے سوال کیا۔

"منیژہ۔"

"کتنا حسین نام ہے آپ کا" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا" اور

تاریخی بھی۔ فردوسی کے شاہ نامہ کی دختِ افراسیاب کے نام پر۔"

میری بات کا پہلا ٹکڑا تو شاید منیژہ بھی نہ سمجھ سکیں، لیکن دونوں نے مسکرا کر سر ہلایا جس سے اندازہ ہوا کہ شاہ نامہ، فردوسی اور دختِ افراسیاب کی مناسبت سے میری بات کا دوسرا ٹکڑا انھوں نے سمجھ لیا ہے۔

"مرسی" خاتون نے فرانسیسی میں شکریہ ادا کیا۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ گفتگو کا سلسلہ کس طرح آگے بڑھایا جائے کہ ایک خوش رو اور خوش پوش نوجوان کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک اور ایرانی تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی سی ٹوکری تھی، جس میں پھل اور کھانے کا سامان تھا۔

"یہ میرے بڑے بھائی، عباس مرزا ہیں" منیژہ نے نوجوان کا تعارف کرایا۔

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ گاڑی نے کوچ کی سیٹی دی اور اس کے ساتھ ہی ایرانی رستوران کا نوجوان منیجر ہانپتا کانپتا نمودار ہوا۔ اس کے سر پر وہی نیا ہیٹ اور ہاتھ میں دفتی کا ایک ڈبا تھا۔

"یہ تمھارا رات کا کھانا ہے" یہ کہہ کر ڈبے کو میرے سامنے رکھتے ہوئے، ہنس کر فوجی انداز میں اس نے سلوٹ[1] کیا، اور لپک کر رینگتی ہوئی گاڑی سے اتر گیا۔

---

[1] salute

ڈبا کھول کر دیکھا تو ایک بھنا ہوا چھوٹا سا چوزہ، چار ابلے ہوئے انڈے — جسے ایرانی تخم مرغ کہتے ہیں، ایک ڈبل روٹی، امریکن مکھن اور پنیر کے دو چھوٹے پیکیٹ، کچھ پھل اور امریکن بیر کی ایک بوتل بھی تھی۔

"اس سامان کے کتنے تومان دیے آپ نے؟" عباس نے سوال کیا۔

اس کے جواب میں پورا قصہ میں نے سنا دیا، جسے فارسی میں دہرا کر انھوں نے باپ اور بہن کو سنایا۔ میں نے بڑھ کر ڈبا منیژہ کے سامنے رکھ دیا، جو بڑی دل چسپی سے اس قصے کو سن رہی تھیں۔

"یہ سامان بھی تیس تومان سے کم کا نہیں ہے" ڈبے کا جائزہ لینے کے بعد منیژہ نے فخریہ لہجے میں کہا "ایرانی کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتے۔"

کریما دا مقیماں اور گلستاں و بوستاں پڑھے ہوئے ہندستانیوں کی طرح میں بھی اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ ایران میں کام چلانے بھر کی فارسی تو مجھے آتی ہی ہے، لیکن ان ہم سفر ایرانیوں کے سامنے میری "فارسی دانی" کچھ کام نہ آئی۔ ان لوگوں نے میری خاطر ٹھہر ٹھہر کر اور لہجہ بدل بدل کر جو باتیں کیں ان کے سمجھنے میں تو مجھے زیادہ دقت نہ ہوئی، لیکن جو باتیں انھوں نے آپس میں کیں، وہ تو بہت کم میرے پلّے پڑیں۔

ایک گونگا بہرا ملازم بھی اس خاندان کے ساتھ تھا، جس سے بات چیت اشاروں سے کی جاتی تھی، اور متوجہ کرنے کے لیے اس

کے شانے ہلائے جاتے تھے۔ ان تمام خامیوں کے باوجود ان سب کے، یا کم از کم آقائے جعفر زادہ کے معمولات کا اسے پورا پورا علم تھا۔ اکثر باتیں وہ بن کہے کرتا تھا۔ مثلاً گاڑی چلتے ہی بلا کسی کے کہے ہوئے اس نے ایک ٹوکری کھولی، سماور نکال کر گرم کیا، اور چائے کا ایک دور چلا دیا۔ پھر ایک اور ٹوکری سے حقے کا سامان نکالا اور حقہ بھر کر جعفر زادہ کے سامنے رکھ دیا۔ ان سب فرائض سے سبک دوش ہو کر کمپارٹ منٹ کے ایک کونے میں پرانے قالین کا ایک ٹکڑا ڈال کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

آٹھ بجے کے قریب آقائے جعفر زادہ نے ایک بیگ سے، جو اوپر ٹنگا تھا، جائے نماز نکالی اور اپنی برتھ ہی پر عشا کی نماز شروع کر دی۔ عباس تو میری برتھ پر بیٹھے ہی تھے، اب منیژہ بھی اجازت لے کر اسی پر آ گئیں۔ ڈھائی تین گھنٹے کے ساتھ میں یہ پہلا موقع تھا کہ منیژہ کو آنکھ بھر کر میں نے دیکھا۔ چشم و ابرو کی ساخت، لب و رخسار کی تراش خراش، اور جسم کے دوسرے اعضا کی بناوٹ ان ترکانِ شیرازی کی سی تھی، جن کی مدح میں ایرانی شعرا نے دفتر رنگین کیے ہیں۔ لیکن لباس کی قطع برید اور میک اپ کا انداز —— بس یہ لگتا تھا کہ پیرس یا ہالی وُڈ کے کسی آرایش خانے سے نکلی چلی آ رہی ہیں۔ اس وقت منیژہ کو دیکھ کر بے اختیار عمر خیام کی رباعیات کا فٹز جی رلڈ اڈیشن یاد آ گیا۔

عباس عراق کے متعلق میرے تاثرات پوچھتے اور اپنے بیان کرتے رہے۔ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی اس لیے منیژہ

اس میں حصہ نہ لے سکیں۔ کچھ دیر بعد عباس نے اٹیچی کیس سے رات کے کپڑے نکالے اور غسل خانے کا رخ کیا۔ میں خاموش بیٹھا کھڑکی کے باہر کی اس دھندلی تاریکی کو گھورتا رہا، جسے ابھرتا ہوا چاند اپنی مدھم روشنی کی چادر سے ڈھکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گاڑی ایک پہاڑی سرنگ میں داخل ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی گھڑگھڑاہٹ اور تیز ہوگئی۔ منیژہ نے کچھ فارسی میں کہا، غالباً اسی سرنگ کے بارے میں، جو میں بالکل سمجھ نہ سکا۔

"پَاردُوں!" غیر ارادی طور پر میری زبان سے نکلا (جس کا مطلب ہے — "معاف کیجیے میں سمجھا نہیں، ذرا پھر فرمائیے") اگرچہ فرانسیسی شاید مجھے اس سے بھی کم آتی تھی، جتنی منیژہ کو انگریزی۔

"موسیو پَارلے فرانسوی (آپ فرانسیسی بولتے ہیں)؟" خاتون نے خوش ہو کر سوال کیا۔

"فرانسوی ہم نمی دانم" بے بسی اور ندامت کے ملے جلے لہجے میں میں نے کہا۔

اس کے جواب میں منیژہ نے اس طرح میری طرف دیکھا، جیسے میرے ہی ساتھ نہیں بلکہ اپنے ساتھ بھی انھیں ہمدردی ہو۔ آقائے جعفر زادہ بھی اب نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ منیژہ نے اٹھ کر نوکر کا شانہ ہلایا، جس پر غنودگی سی طاری تھی۔ اس نے سر اٹھا کر آقائے جعفر زادہ کی طرف دیکھا، خاموشی سے اٹھا، جائے نماز لپیٹ کر بیگ میں رکھی، اور برتھ کے نیچے سے ایک پتلا سا قالین

نکالا، جو چرمیکے کی طرح لپٹا تھا۔ دونوں برتھ کا درمیانی حصّہ صاف کرنے کے بعد قالین بچھایا اور اسی پر دسترخوان لگا دیا۔ یہ سب کام اس نے بغیر کہے ہوئے کیے۔ بھوک مجھے بالکل نہیں تھی، اور رات کو کھانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ لیکن ہم سفروں کے پیہم اصرار سے مجھے بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔ کھانے کے دوران منیرہ نے کچھ فرانسیسی میں عباس سے کہا۔

"یہ کہہ رہی ہیں" عباس نے ان کی ترجمانی کی "اس کمپارٹمنٹ میں آپ کو دیکھ کر انھیں بہت خوشی ہوئی تھی۔"

"کیوں؟"

"اس لیے" عباس نے براہِ راست جواب دیا "آپ کی جگہ کوئی انگریز ہوتا تو ہم سب کو کوفت ہوتی، اور امریکن ہوتا تو الجھن ہو جاتی۔"

"امریکنوں اور انگریزوں کو آپ لوگ پسند نہیں کرتے؟" میں نے مزید سوال کیا۔

"انگریزوں سے تو ہمیں نفرت ہے اور امریکنوں کو بھی شریف ایرانی پسند نہیں کرتے۔ وہ بڑے چھچھورے ہوتے ہیں۔ اور بہت جلد بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی جگہ پر کسی ایشیائی کا ہم سفر ہونا بڑی نعمت ہے۔"

"اینڈ یو مسلم ٹو (اور تم تو مسلمان بھی ہو)" منیرہ نے اضافہ کیا، جو ہمارے سوال و جواب کو بڑے غور سے سن رہی تھیں۔

ان ہم سفروں کے لباس، گفتگو کے انداز، اور سازوسامان سے

ظاہر ہو رہا تھا کہ ایران کے بالائی طبقے سے ان کا تعلق ہے۔ یہ مختصر سا خاندان جو کربلائے معلّا کی زیارت سے لوٹ رہا تھا، رشت کا رہنے والا تھا، جو بحر کاسپین کے کنارے آباد اور اپنے نفیس چاولوں کے لیے مشہور ہے۔ ان میں سے ہر شخص کا لباس اور ظاہری وضع قطع تو خالص مغربی تھی؛ لیکن فکر و عمل کے میدان میں قدیم وجدید یا مشرق و مغرب کی وہ کشمکش یہاں بھی بدرجۂ اتم موجود تھی، جو مشرق میں ہر جگہ کہیں کم کہیں زیادہ نظر آتی ہے۔ آقائے جعفر زادہ تو خاصے مذہبی تھے۔ ان کے فیشن ایبل اور قیمتی بیگ میں جائے نماز اور سجدہ گاہ کے ساتھ ساتھ غالباً قرآن کا ایک نسخہ بھی تھا، جس پر خوب صورت سا جزدان چڑھا تھا۔ نماز کے بعد دیر تک انھوں نے وظیفہ بھی پڑھا۔ عباس سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ حج بھی وہ کر چکے ہیں اور ہر سال شام و عراق کے مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ کربلائے معلا میں اُن کا ذاتی مکان بھی ہے۔ ایران کے دوران قیام میں بیش تر زمانہ مشہد مقدس میں بسر کرتے ہیں۔ لیکن عباس اور منیژہ کا حال اپنے باپ سے مختلف بلکہ بڑی حد تک ان کے برعکس تھا۔ ان دونوں نے تہران کے کسی فرانسیسی اسکول میں ابتدائی تعلیم پائی تھی، اور اعلا تعلیم کے لیے فرانس پہنچے ہی تھے کہ لڑائی شروع ہو گئی، اور انھیں واپس لوٹنا پڑا۔ مذہبی خیالات کا جہاں تک تعلق ہے، ان کی آزاد خیالی کے ڈانڈے لامذہبیت سے مل جاتے تھے۔

کھانے کے بعد جب سونے کا وقت آیا تو میں نے تجویز پیش

کی کہ آقائے جعفر زادہ کا بستر نیچے میری برتھ پر لگا دیا جائے، اور میں اوپر چلا جاؤں۔ لیکن میرے انتہائی اصرار کے باوجود وہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔

"اس عمر میں بھی تم سے زیادہ جوان ہوں" کہہ کر انھوں نے جست لگائی اور اوپر پہنچ گئے۔ پھر "شب بخیر" کہتے ہوئے چادر تان لی۔

صبح کو آنکھ کھلی تو جعفر زادہ سامنے کی اوپری برتھ پر دیوار کی ٹیک لگائے وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ان کے مقابل کی برتھ پر عباس ہلکے ہلکے خراٹے لے رہے تھے۔ منیزہ میرے سامنے ہی کی برتھ پر، اپنے نچلے آدھے جسم پر ہلکا سا کمبل ڈالے تکیے کے سہارے نیم دراز تھیں۔ ٹرین کسی پہاڑی نشیب و فراز کو ہانپتی کانپتی طے کر رہی تھی۔ دور، بہت دور، مٹ میلی چوٹیوں پر سفیدی مائل تحریریں اس طرح نظر آ رہی تھیں، جیسے کسی بوڑھی عورت کے موٹے موٹے آنسو بہہ کر اس کے رخساروں پر ڈھلک رہے ہوں۔

"این یخ است؟" برف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منیزہ سے میں نے سوال کیا، جو میری ہی طرح اسے تک رہی تھی۔

"یخ نیست این برف است" منیزہ نے ارادی یا غیر ارادی طور پر، بڑی معصومیت سے میری اصلاح کی۔

مجھے خیال آیا کہ مصنوعی اور قدرتی دونوں برفوں کے لیے اردو میں ہم برف ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں، لیکن فارسی میں

مصنوعی برف کو یخ اور قدرتی برف کو برف کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی نورجہاں کا ایک جملہ مجھے یاد آیا جو ابو طالب کلیم کا ایک شعر سن کر اس نے کہا تھا۔ جہانگیر کلیم کی شاعری کا شیدائی تھا، اور نورجہاں کو اس سے چڑھ تھی۔ اس کے اچھے سے اچھے شعر پر کوئی نہ کوئی اعتراض ضرور جڑ دیتی۔ ایک دن جہانگیر نے کلیم کا یہ شعر اس اعتماد کے ساتھ بیگم کو سنایا کہ اس پر وہ کوئی اعتراض نہ کر سکے گی۔

ز شرم آب شدم کہ آب را شکست نیست
بحیرتم کہ مرا روزگار چوں شکست!

"اس میں حیرت کی کون سی بات ہے" نورجہاں نے برجستہ کہا "یخ بست و بشکست"۔

اسی ٹرین میں ایک اور ایرانی خاتون طاہرہ سعید بھی سفر کر رہی تھیں۔ ابھی، کچھ ہی دن پہلے تک، ہمارے تہران کے دفتر "ادارۂ عمومی آرتش ہندستان" — انڈین آرمی پبلک ریلے شنس سے ان کا بھی تعلق تھا، اور وہ اردو میں خبریں نشر کیا کرتی تھیں۔ ان کے والد ایک زمانے تک لکھنؤ یونیورسٹی سے وابستہ رہے تھے، اور یہ وہیں پیدا ہوئی اور بڑھی تھیں۔ اردو اتنی ہی اچھی بولتیں جتنی کوئی بھی اردو داں بول سکتا ہے۔ نہایت خلیق، متواضع اور ملنسار۔ ایران کے دوران قیام میں ان کے گھر جا کر اپنا گھر یاد آجاتا" اور پھر ان کی باتوں میں گم ہو کر گھر کی یاد بھی

تحلیل ہو جاتی۔ حیدر آباد رجمنٹ کے میجر سعید سے انھوں نے حال ہی میں شادی کی تھی، ان ہی کے ساتھ وہ بغداد گئی تھیں، جہاں میری اور ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

میں اپنے ہم سفر ایرانی خاندان میں ایسا گم ہوا کہ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ طاہرہ بھی اسی گاڑی میں سفر کر رہی ہیں۔ صبح کے ناشتے کے بعد میں ان کی طرف چلا گیا۔ ایک انگریز اور ایک ہندستانی افسر بھی ان کے کمپارٹ منٹ میں تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد برطانیہ کے انتخابات کی باتیں ہونے لگیں۔

"کنزرویٹوز کے ہارنے کی تو ہندستانیوں کو خوشی ہوئی ہو گی" انگریز افسر نے کچھ تیکھے لہجے میں کہا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا "کچھ خوشی ہوئی تو مگر صرف اس خیال سے کہ برطانیہ میں قدامت پسندی کی جو برف ایک مدت سے جمی رہی ہے اب شاید وہ کچھ پگھلے۔"

"اور ہندستان کو کچھ فائدہ نہ ہوگا؟"

"کم از کم مجھے تو اس کی زیادہ امید نہیں ہے۔"

طاہرہ تو یہ باتیں شاید دل چسپی سے سن رہی تھیں، لیکن ہندستانی افسر کو، جو کشمیری مسلمان ڈاکٹر تھا، اس گفتگو نے شدید الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ موضوع کو بدلنے کے لیے اس نے ایران کے پھلوں کی

Conservatives

اور وہاں کے موسم کی باتیں شروع کر دیں۔ میں بھی بلاوجہ کی بحث میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے ڈاکٹر کی باتوں میں میں نے بھی دل چسپی لی لیکن انگریز افسر نے، جو دراصل تہران کے برطانوی سفارت خانے سے متعلق تھا، شملہ کانفرنس کا ذکر چھیڑ دیا۔

"شملہ کانفرنس کی ناکامی کے کیا اسباب ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"اس کے بارے میں کوئی قطعی رائے قایم کرنا، کم از کم میرے لیے، ممکن نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں تو اس کی ناکامی کا کھلا ہوا سبب ہندستانی لیڈروں کی نااتفاقی ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ آپ کا خیال صحیح ہو" میں نے جواب دیا "لیکن اگر ایسا ہوا بھی تو یہ ہماری تاریخ کا پہلا واقعہ نہ ہوگا۔ اس سے پہلے گول میز کانفرنس میں بھی برطانوی ڈپلومیسی ہندستانی لیڈروں کی نااتفاقی کو ہوا دے کر ہندستان کے معاملے کو کھٹائی میں ڈال چکی ہے۔"

بات بڑھتے بڑھتے ایک نازک موڑ پر پہنچی ہی تھی کہ گاڑی کی رفتار میں کمی پیدا ہوئی، اور ہندستانی افسر نے اپنا سامان پیٹنا شروع کیا، اور اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے مجھ سے بھی اس نے درخواست کی۔ اگلے اسٹیشن کے قریب ہی اس کی کمپنی تعینات تھی۔ گاڑی رکی تو ڈاکٹر کو خدا حافظ کہنے اور ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے میں بھی گاڑی سے باہر آیا۔

آبادان سے تہران تک

"آپ کی یہ باتیں نامناسب تھیں" ڈاکٹر نے ہاتھ ملاتے ہوئے نصیحت کی "ہم فوجیوں کا سیاست سے کوئی واسطہ نہ ہونا چاہیے۔"

"شکریہ" میں اور کچھ نہ کہہ سکا اور وہ رخصت ہو گیا۔

دوپہر کے بعد گاڑی تہران پہنچی۔ ریگ زار بغداد سے نکل کر مرغزار تہران میں قدم رکھتے ہی محسوس ہوا کہ دوزخ کی میعاد ختم ہونے کے بعد ارباب قضا و قدر نے جنت میں پہنچا دیا ہے۔ تہران ریلوے اسٹیشن کے ہندستانی فوجی عملے کی ایک جیپ نے اس کیمپ تک پہنچا دیا، جہاں مجھے وقتی طور پر قیام کرنا تھا، اور جو شہر کے آخری حصے میں، خیابان پہلوی کے سرے پر ایک خوش نما پہاڑی کے دامن میں تھا۔ اس کے سامنے رضا شاہ کا ایک قدآدم مجسمہ اور پشت پر تہران یونیورسٹی کا لق و دق احاطہ تھا۔

چار بجے کے قریب دفتر پہنچا، جو قلب شہر کے ایک فیشن ایبل بازار خیابان لالہ زار کی ایک سہ منزلہ عمارت کی پہلی منزل میں تھا۔ دفتر کا فوجی عملہ تین افسروں، ایک ٹائپسٹ کلرک، ایک چپراسی پر مشتمل تھا۔ ان کے علاوہ ایک سویلین چپراسی بھی تھا۔ اس دفتر کے 'خداوند' ن م راشد تھے، جو اردو کے اُن اِنے گنے شاعروں میں ہیں، جنھوں نے شاعری کی مروجہ اور روایتی ڈگر سے ہٹ کر، نئی راہیں نکالنے کی کوشش کی ہے۔ راشد سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اچھی طرح ملے اور دوسرے رفیقوں سے تعارف کرایا۔

"آتے ہی آپ کی رپورٹ بھی ہو گئی" رسمی باتوں کے بعد راشد نے سنجیدگی سے کہا۔

"کس بات کی؟"

"گاڑی میں کسی انگریز فوجی سے آپ بھڑ گئے تھے؟ سفارت خانے نے اطلاع دی ہے۔"

یہ سن کر مجھے کچھ پریشانی ضرور ہوئی، جسے میں نے ظاہر نہ کیا، لیکن جلد ہی خود راشد نے بھانڈا پھوڑ دیا، اور بتلایا کہ دفتر آتے ہوئے وہ طاہرہ سے ملنے گئے تھے، اور اُن ہی نے یہ قصہ بیان کیا تھا۔

تہران میں اسٹاف کی مناسبت سے کام کم تھا۔ بغداد کی طرح یہاں اخبار کا بکھیڑا نہیں تھا۔ لے دے کے ریڈیو کا پروگرام تھا، وہ بھی صرف ایک گھنٹے کا، جس کے لیے دو آدمی تھے اور ان کی مدد کے لیے دو ہندستانی نژاد ایرانی لڑکیاں صدیقہ بانو اور ایران بانو بھی تھیں۔ دفتری زندگی خاصی ہموار مگر غیر دلچسپ تھی۔ کبھی کبھی راشد اپنی زیرِ تصنیف طویل نظم "ایران میں اجنبی" کے تازہ بند سنا کر دفتر کی بے آب و رنگ زندگی میں رنگینی پیدا کر دیا کرتے تھے، جس کے چند جستہ جستہ مصرعے ذہن نے محفوظ کر لیے تھے۔

یہ داریوش بزرگ کی سرزمیں
یہ نوشیروان عادل کی دادگاہیں

یہاں زندگی کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں

یہاں بھی وہاں بھی وہی آسماں ہے
مگر اس زمیں سے خدایا رہائی!

نو اگست کی تیسری سال گرہ

تہران پہنچے کے چند ہی روز بعد دن کے دو بجے دفتر میں تنہا بیٹھا سہ پہر کو نشر کیا جانے والا پروگرام مرتب کر رہا تھا کہ آفت ناگہانی کی طرح مجید کمرے میں داخل ہوئے۔

۳۸-۱۹۳۷ء میں مجید لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم تھے، اور وہیں پہلی بار ہم ملے تھے۔ ملک کے اور نوجوانوں کی طرح انھیں بھی سیاست سے خاصی دل چسپی تھی، لیکن بیشتر طالب علموں کی طرح عملی سیاست سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ ۱۹۳۹ء کے اوایل میں اینگلو ایرانین آیل کمپنی میں انھیں ملازمت مل گئی اور وہ ایران چلے گئے۔ میرے تہران پہنچنے کے تیسرے یا چوتھے دن کتابوں کی ایک دکان میں ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں اس وقت تک ایران میں "غریب شہر" تھا، اور اپنے دفتری ماحول سے بھی مانوس نہ ہوا تھا، اس لیے یہ اتفاقی ملاقات خداداد نعمت معلوم ہوئی، اور لکھنؤ کی شناسائی نے جلد ہی دوستی کا رنگ اختیار کر لیا۔ مجید کا دفتر تو آبادان میں تھا،

لیکن دسویں پندرہویں انھیں تہران بھی آنا پڑتا۔ اس طرح مہینے میں آٹھ دس دن وہ تہران ہی میں رہتے، اور ان دنوں میں، دفتری اوقات کے علاوہ بیش تر وقت ہم ایک ساتھ گزارتے۔

"آج تم بہت برے وقت پر آئے ہو مجید" صاحب سلامت کے بعد میں نے کہا "آج بہت کام کرنا ہے مجھے۔"

"کیے جاؤ کام" مجید نے لاپروائی سے کہا "تمھیں بیل کی طرح کام میں جتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی۔"

الماری میں سے فرمایشی گانوں کے وہ ریکارڈ میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا رہا، جو آج کے پروگرام میں سنانے تھے، اور مجید ٹہل ٹہل کر ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ کبھی کبھی اس کی کسی بات کا میں جواب بھی دے دیتا۔ ٹہلتے ٹہلتے ایک بڑے سے کلینڈر کے سامنے وہ کھڑا ہوگیا۔

"آج نویں اگست ہے" تاریخ کے خانے میں انگلی رکھتے ہوئے مجید نے کہا "۹ اگست ۱۹۴۲ء کی تیسری سال گرہ!"

"ہاں آج ۹ اگست ہے" چند لمحوں تک مجید کی بات پر غور کرنے کے بعد میں نے جواب دیا "تم ٹھیک کہتے ہو، آج ۹ اگست ۱۹۴۲ء کی تیسری سال گرہ ہے۔"

"میں ہمیشہ ٹھیک بات کہتا ہوں" مجید نے سینہ تان کر کہا "اس یادگار دن کو تو منانا چاہیے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ آج تمھاری قومیت کی رگ یکایک بیدار ہوگئی ہے۔"

"میری قومیت کی رگ خوابیدہ کبھی نہیں رہتی" اس نے فخریہ لہجے میں جواب دیا "میری تجویز ہے کہ آج شام کو تم میرے ہوٹل آجاؤ، وہیں اطمینان سے ۹ اگست منائیں گے۔ اچھا میں جاتا ہوں، مجھے بھی کچھ ضروری کام ہیں۔"

اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ کمرے سے نکل گیا۔

"آؤ" مجھے دیکھتے ہی مجید نے کہا۔ خلاف معمول آج وہ ہندستانی لباس میں، ہندستانی وضع سے فرش پر ٹانگیں پھیلائے، تکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔

"آج تو تم بالکل نئے آدمی معلوم ہو رہے ہو" میں نے بھی فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ابھی بیٹھو نہیں" تحکمانہ لہجے میں مجید نے کہا "آج تم بھی اس لعنت کو اتار پھینکو۔ غسل خانے میں جاؤ وہاں کرتا پاجامہ تمھارے لیے بھی رکھا ہے، آج تم بھی نئے آدمی بن جاؤ۔"

مجھے یہ ساری باتیں کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں، لیکن ان میں تصنع یا بناوٹ کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

"آج تمھیں کیا ہو گیا ہے؟" میں نے کچھ حیرانی سے سوال کیا۔

"۹ اگست ہو گیا ہے" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا، پھر شاعرانہ انداز میں کہنا شروع کیا "کتنی رومانیت، کتنی

جاذبیت کتنی کشش ہے اس تاریخ میں۔ حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد دنیا کی تاریخ میں یہی دن ۱۹۴۱ بار آچکا تھا، لیکن ۱۹۴۲ کے عیسوی سال کی نویں اگست کا دن ہماری ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے۔ ہمارے ملک نے ــــ دنیا کے ایک غلام اور مجبور و محکوم ملک نے ــــ دنیا کی وسیع ترین سلطنت کی مالک قوم کو للکار کر کہا 'ہندستان چھوڑ دو'، ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم آزاد ہوں گے، ہم نے عزم کیا ہے کہ اپنی غلامی کی بیڑیاں کاٹ کر پھینک دیں گے۔ کتنی رومانیت، کتنی جاذبیت، کتنی کشش ہے ۹ اگست کی تاریخ میں"۔

مجید کی باتیں میں دل چسپی سے سن رہا تھا۔ یوں تو ساغر و مینا کو دیکھتے ہی وہ ہمیشہ باغ و بہار بن جاتا تھا اور اس کی گل افشانی گفتار قابل دید و شنید ہوتی تھی۔ لیکن آج اس پر سرخوشی و سرمستی سے زیادہ وجد کی سی کیفیت طاری تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کوہ دماوند کی بلند و بالا چوٹیوں کی اوٹ سے ابھرتے ہوئے چاند نے، جس کی ہلکی و خنک روشنی براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، اس کے جام کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

"۹ اگست ۱۹۴۲ء کو میں ہندستان میں نہیں تھا۔" گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے مجید نے کہا "میرے پیر دل میں تو ملازمت کی بیڑیاں پڑی تھیں، اور میں وطن سے ہزاروں میل دور تھا، لیکن میں نے لوگوں سے سنا ہے

کہ اسی ۹ اگست کو:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

"نوجوان ہی نہیں جو من چلے اور عاشقی کے پتلے ہوتے ہیں، بلکہ ہندستان کے بچّے اور بوڑھے بھی اس 'آتشِ نمرود' میں بے خطر کود پڑے تھے۔ مجھے لوگوں نے بتلایا ہے کہ اس وقت ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اک آگ سی لگی تھی۔ بیسویں صدی کی دوسری عظیم جنگ شباب پر تھی، اور اپنے آغاز کا تیسرا سال ختم کر کے ایک فیصلہ کن منزل میں داخل ہونے ہی والی تھی۔ مغرب میں جرمنی اور اٹلی کی فاشسٹ فوجیں ایک طرف افریقہ کو اور دوسری طرف مشرقی یورپ اور سوویٹ روس کو تاراج کرتی ہوئی مغربی ایشیا کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ مشرق میں فاشسٹ جاپان کی فوجیں دکھنی پوربی ایشیا کو روندتی ہوئی ہندستان کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں —— اور ہندستان میں داخلی بغاوت کے طوفان امڈ رہے تھے۔ دکھنی پوربی ایشیا اور ہندستان کو 'فاشستی درندوں' سے بچانے کے لیے ہندستان کی سرزمین برطانوی اور امریکی فوجوں سے پٹی پڑی تھی۔ ان ایشیائی ملکوں کو بچانا اس لیے ضرور تھا کہ برطانیہ کی سامراجی سرحدیں رود بار انگلستان سے نہیں بلکہ ہندستان اور دکھنی پوربی ایشیا سے شروع ہوتی ہیں۔ ایشیا کے یہ حصے اگر نکل جائیں تو انگلستان کی بھی

خیر نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ برطانوی فوجیں جو ہندستان ہی کی حفاظت کے لیے ہندستان میں ڈیرے ڈالے تھیں نہتّے ہندستانیوں کے مقابلے میں صف آرا کر دی گئی تھیں۔ لیکن 'ہندستان چھوڑ دو' کے طوفان کو وہ بھی نہ روک سکیں۔ ملک کے گوشے گوشے سے 'ہندستان چھوڑ دو' کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، اور ان کی صدائے بازگشت انگلستان اور امریکا کے سرکاری ایوانوں میں بھی گونج رہی تھیں۔ برطانوی سپاہی رات کو 'ہندستان چھوڑ دو' کے خواب دیکھتے تھے اور نیند میں بھی وہ اسی کی صدائیں سنتے تھے۔"

مجید بولتے بولتے یکایک خاموش ہو گیا، جیسے تھک گیا ہو یا اس کی قوت گویائی اس کے جذبات کی رو کا ساتھ دینے سے قاصر ہو۔ اس کے چہرے کی تمتماہٹ، آنکھوں کی سرخی، اور رگوں کا تناؤ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ وہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہے۔ آنکھیں بند کر کے تکیے کے سہارے وہ نیم دراز ہو گیا۔ میں بھی اس کے سینے کا سہارا لے کر لیٹ گیا۔ کمرے میں ایسا مکمل سکوت طاری تھا کہ مجید کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

"یار یہ بتاؤ" کچھ دیر بعد لیٹے ہی لیٹے اس نے سوال کیا "تم تو کانگرسی تھے، تم اس آگ میں کیوں نہیں کودے؟"

اس بار مجید کی آواز میں نرمی و گھلاوٹ تھی، جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا اعصابی تناؤ کچھ کم ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے اس سوال نے، جو میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا، میری دکھتی ہوئی

رگ کو اس طرح دبوچا تھا، جیسے شکاری کتا کسی خرگوش کو گردن سے جا لیتا ہے۔

"تمھارا سوال درست ہے" تلملا کر میں نے جواب دیا "میں آج بھی کانگرسی ہوں"۔

"لیکن تمھارے اس جواب میں کچھ تضاد ضرور ہے" مجید نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اس تضاد کو سمجھنے کے لیے تمھیں کانگرس کی تاریخ پر نظر ڈالنی ہوگی" میں نے جواب دیا "تمھیں یہ بات ذہن نشین کرنی ہوگی کہ کانگرس خود مجموعۂ اضداد ہے"۔

"یہ تو فلسفۂ تاریخ کا بالکل نیا نظریہ تم پیش کر رہے ہو" مجید نے کچھ ناک بھوں چڑھا کر کہا "تم اپنی بزدلی کو اس نئے فلسفے سے شاید ڈھکنے کی کوشش کر رہے ہو"۔

"تمھارا یہ بے رحمانہ خیال صحیح نہیں ہے" میری آواز غیر ارادی طور پر کچھ تیز ہو گئی "اپنی قوم پرستی کا اظہار کر کے میری قوم پرستی کی توہین کرنے کا جواز تم پیدا نہیں کر سکتے"۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو" مجید نے کچھ نرم لہجے میں سوال کیا "کانگرس کے مجموعۂ اضداد ہونے سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"کانگرس اپنے ابتدائی دور ہی سے سیاسی پارٹی سے زیادہ سیاسی پلیٹ فارم رہی ہے" میں نے اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی "۱۹۲۴ء تک اس میں صرف دو متضاد عناصر رہے۔ ایک متحدہ قومیت کا ماننے والا تھا، اور دوسرا

ہندو راشٹر کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ۱۹۲۴ء کے بعد اس میں کم ازکم دو اور متضاد عناصر شامل ہو گئے — ہندستانی سرمایہ داری کے ایجنٹ اور کمیونسٹ، جو ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے ان تمام متضاد عناصر کو انگریز دشمنی کے مشترک جذبے نے کانگرس کے دھاگے میں پرو دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے کو کانگرسی کہتا تھا' اور دوسرے کے کانگرسی ہونے کا بھی منکر نہیں تھا۔ اسی لیے کانگرس کو میں نے مجموعۂ اضداد کہا ہے"۔

"اچھا تو تمھارا تعلق ان میں سے کس تضاد سے تھا؟" مجید نے تیکھے انداز میں سوال کیا۔

"جہاں تک میرا تعلق ہے" سوال کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے سنجیدگی سے جواب دیا "قوم پرستی مجھے وراثتہً ملی ہے۔ میرے باپ کٹر نیشنلسٹ تھے۔ مرتے وقت بھی انھوں نے وصیت کی تھی کہ کھدر میں انھیں کفنایا جائے۔ ۱۹۳۷ء میں کانگرس کی سرگرمیوں میں جب میں نے عملی حصہ لینا شروع کیا تو کانگرس کے کمیونسٹ گروپ میں مجھے زیادہ کشش محسوس ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ کانگرس کا باضابطہ ممبر بننے سے پہلے سوشلزم کی مبادیات سے میرا ذہن آشنا ہو چکا تھا۔ چناں چہ جلد ہی میں بڑی حد تک تو کمیونسٹ بن گیا' لیکن میرا ذہن بنیادی طور پر کانگرسی ہی رہا۔ ایک زمانے میں مجھے اپنے

متعلق یہ شبہ بھی ہو چلا تھا کہ کمیونزم نے میری کانگریسی رگ کو دبا لیا ہے، لیکن آگے چل کر میرا یہ گمان غلط ثابت ہوا۔ "ابتدائی دور ہی میں کمیونسٹوں کے طریق کار نے ایک موقع پر مجھے غیر محسوس طور پر متزلزل بھی کیا، لیکن یہ جھٹکا اتنا شدید نہیں تھا کہ میرے پیر اکھڑ جاتے۔ یہ قصہ ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء کا ہے۔ اس وقت یو.پی کانگریس دو غیر واضح گروہوں میں بٹی تھی۔ ایک رفیع احمد صاحب قدوائی کا گروہ تھا، اور دوسرا آچاریہ نرندر دیو کا، جو پکے نیشنلسٹ تھے۔ سوشلسٹ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی کا اگرچہ الگ الگ وجود تھا، لیکن کانگریس کے اندر ان دونوں میں مکمل اتحاد تھا۔ اس سال یو.پی کانگریس کی صدارت کے لیے سوشلسٹ پارٹی نے دمودر سروپ سیٹھ کو اور ان کے مقابلے میں قدوائی صاحب نے موہن لال سکسینہ کو کھڑا کیا۔ الکشن سے ایک روز پہلے قدوائی صاحب نے کمیونسٹوں کو، یہ وعدہ کر کے، توڑ لیا کہ وہ اگر موہن لال سکسینہ کو ووٹ دیں، تو نئی ایکزیکٹو کمیٹی میں دو تین کمیونسٹوں کو بھی وہ لے لیں گے۔ یو.پی، پراونشل کانگریس کمیٹی کے بیشتر مسلمان ممبر مولانا حفظ الرحمٰن کی قیادت میں بالعموم سوشلسٹوں کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ چناں چہ آچاریہ نرندر دیو کو یقین تھا کہ اس موقع پر بھی کمیونسٹ اور مسلمان ان ہی کے امیدوار کو ووٹ دیں گے۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ جمعہ کا دن تھا، اور تین بجے الکشن ہونے والا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب دہلی سے آئے تھے، لیکن جمعہ کی نماز کے بعد انھیں جلسے میں پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ الکشن مقررہ وقت پر شروع ہوا تو کمیونسٹوں نے موہن لال سکسینہ کو ووٹ دیا اور مسلمانوں نے بھی ان کی تقلید کی۔ دمودر سروپ بری طرح ہارے۔ اسی دن شام کو موہن لال سکسینہ نے ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبروں کے ناموں کا اعلان کیا تو قدوائی صاحب کے وعدے کے مطابق اس میں دو کمیونسٹوں کے نام بھی تھے، اور دو سوشلسٹوں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ دوسرے دن نئی ایگزیکٹو کمیٹی کا جلسہ تھا۔ میں ان دنوں پراونشل کانگرس کمیٹی کے دفتر ہی میں کام کرتا تھا۔ جلسے سے کچھ دیر پہلے ہمارے کمیونسٹ دوست وہاں تشریف لائے۔"

"کون کون تھے؟" مجید نے سوال کیا۔

"سجاد ظہیر، ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر علیم اور شاید بھر دواج بھی تھے۔ اس وقت تک انھیں اس کا پتہ نہیں تھا کہ سوشلسٹ پارٹی کے ممبر موہن لال سکسینہ کی نئی ایگزیکٹو کمیٹی میں شریک ہوں گے یا نہیں۔ اس کی ٹوہ لینے کے لیے انھوں نے مجھے پکڑا۔ دفتر کے باہر لان پر کچھ دیر آپس میں صلاح مشورے کے بعد سجاد ظہیر میرے پاس آئے، اور مجھ سے کہا کہ میں جا کر آچاریہ نرندر دیو سے کہوں کہ

نواگمت کی تیسری سال گرہ

سوشلسٹ پارٹی اگر نئی ایگزیکٹو کمیٹی میں شریک نہ ہوگی تو کمیونسٹ ممبر بھی اس کا بائیکاٹ کریں گے۔ ان دنوں پراونشل کانگرس کمیٹی کا دفتر اسٹیشن روڈ پر تھا، اور اس کے قریب ہی کونسلر رزیڈنس میں آچاریہ نرندر دیو رہتے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو ان کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میرے کھٹکھٹانے پر دروازہ کھلا، تو سامنے موہن لال گوتم کھڑے تھے۔

"آچاریہ جی تشریف رکھتے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں ہیں، آیئے" گوتم نے جواب میں کہا۔ اچاریہ جی اس وقت بغل کے کمرے میں لیٹے تھے۔

"کہیے، کیسے تشریف لائے؟" میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے لیٹے ہی لیٹے انھوں نے کہا "معاف کیجیے، میری طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے لیٹ گیا ہوں۔"

"مزاج پرسی کے بعد میں نے پیغام سنایا، جسے سنتے ہی ان کا چہرہ سرخ ہوگیا، اور وہ اٹھ بیٹھے۔ ان کو غصہ بہت کم آتا ہے اور ان کی سنجیدگی و بردباری ضرب المثل ہے۔ لیکن اس وقت وہ آپے سے باہر تھے۔ ان کے منہ میں جو آیا، کہہ ڈالا۔

"میں تو پیام بر ہوں،" میں نے کہا" اور مشرقی روایات کے مطابق پیام بر کی گردن نہیں ماری جاتی" یہ سن کر آچاریہ جی کا غصہ کچھ کم ہوا۔

"یہ باتیں میں نے آپ کو نہیں سنائی ہیں" آچاریہ جی نے معذرت کے لہجے میں کہا "میرے مخاطب تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے آپ کو یہاں بھیجا ہے۔ میں نے جو باتیں کہی ہیں، وہ سب آپ ان کو میری طرف سے سنا دیجیے، اور یہ بھی کہہ دیجیے کہ مجھے معلوم ہے کہ سوشلسٹوں کے بائیکاٹ کے باوجود کمیونسٹ موہن لال سکسینہ کی بنائی ہوئی ایگزیکیٹو کمیٹی میں ضرور شریک ہوں گے۔"

"میرا گمان ہے" مجید نے کہا "تم اگر کمیونسٹ نہیں تو ان کے شریکِ سفر ضرور تھے، اور ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو بھی تم یہی تھے، اور آج بھی یہی ہو، ورنہ تمھارے جسم پر یہ مکروہ برطانوی فوجی وردی نہ ہوتی۔"

"تمھارا فیصلہ بہ ظاہر جتنا صحیح معلوم ہوتا ہے، اتنا صحیح ہے نہیں" مجید کی تردید کرتے ہوئے میں نے کہا "۹ اگست ۱۹۴۲ء کا دن ہماری تاریخ میں کئی اعتبار سے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی ۹ اگست کو میرے جیسے لاکھوں نوجوانوں نے — جو کانگرسی بھی تھے اور کمیونسٹ بھی — پہلی بار اس حقیقت کو واضح طور پر محسوس کیا کہ ہمارے وجود کی گہرائیوں میں دو دھارے متوازی بہہ رہے ہیں، جن میں اشتراک نہیں، بلکہ تضاد ہے۔ ان میں سے ایک دھارا قوم پرستی کا ہے اور دوسرا کمیونزم کا۔ عین اس زمانے میں جب ملک کے کونے کونے سے "ہندستان

چھوڑ دو" کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، میرے جیسے لاکھوں نوجوان "آتش نمرود میں بے خطر کودنے" کی آرزو لیے دم بخود کھڑے تھے۔ ہمارے وجود کی اتھاہ گہرائیوں میں کش مکش تھی، جنگ تھی۔ دل کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ ہمارا ملک جل رہا ہے، شعلے بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے ہیں۔ عقل کہہ رہی تھی کہ ملک ہی نہیں جل رہا ہے، ساری دنیا جل رہی ہے۔ ملک ہی کی فکر کی تو سارا عالم جل کر بھسم ہو جائے گا، اور اس کے ساتھ ہی وطن عزیز بھی جل کر راکھ ہو جائے گا۔ ہمارے ذہنوں پر مخدوم کا یہ خیال چھایا تھا:

یہ جنگ ہے جنگ آزادی

ہم ہند کے رہنے والوں کی — محکوموں کی، مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی — دہقانوں کی، مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی!

"یہ فریب تھا عقل فتنہ پرور کا" مجید نے حقارت اور غصے کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

"مگر سوچو تو" میں نے پسپائی کے لہجے میں جواب دیا "اگر یہ فریب تھا عقل فتنہ پرور کا، تو کتنا حسین فریب تھا یہ"۔

"حسن اور فریب میں تو ازل سے چولی دامن کا ساتھ ہے" مجید نے بڑے تیکھے انداز میں کہا "اور یہ اسی فریب کا منتہائے کمال تھا کہ تم انڈین آرمی پبلک ریلیشنز میں

پھنس گئے۔"

"نہیں، پہلے میں انڈین ایر فورس میں پھنسا، اور پھر وہاں سے اچھل کر انڈین پبلک ریلیشنز میں پہنچا۔"

"بہت اچھے" مجید نے حیرت سے کہا "یہ کیسے؟"

"۱۹۴۳ء کے اواخر میں، ایک حادثے کے تحت، فوجی زندگی کا تجربہ حاصل کرنے کا میں نے فیصلہ کیا۔ عزیزوں اور دوستوں نے جوں جوں مخالفت کی، میرا ارادہ پختہ ہوتا گیا، اور ستمبر ۱۹۴۳ء میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سلسلے میں جو چیز سب سے پہلے میرے سامنے آئی، بے چوں وچرا میں نے قبول کر لی۔ یہ تھی انڈین فورس کی باوردی کلرکی۔ تین مہینے لاہور میں اور تین مہینے حیدرآباد میں ٹریننگ لی —— لاہور میں فوجی تربیت اور ڈسپلن کی اور حیدرآباد میں دفتری کام کی۔

"لاہور اور حیدرآباد میں چھ مہینے گزارنے کے بعد اپریل ۱۹۴۴ء میں نئی دہلی کے ائر ہیڈ کوارٹرس میں تعیناتی ہوئی۔ یہاں کی زندگی جیل سے کم نہ تھی۔ آٹھ بجے صبح سے پانچ بجے شام تک دفتر میں وقت گزرتا۔ وہاں سے کیمپ آجاتا، جو صفدر جنگ کے مقبرے کی پشت پر ریس کورس سے متصل تھا۔

"کیمپ میں ڈیڑھ سو بارکیں تھیں۔ ہر بارک میں ستر اسی پلنگ دو رویہ پڑے تھے۔ ہر شخص کا سامان اس کے پلنگ کے نیچے رہتا۔ کسی کی کوئی پرائیوٹ زندگی نہ تھی۔ کیمپ سے

باہر جانے کے لیے درخواست دے کر باضابطہ اجازت لینی پڑتی - قید و بند کی یہ زندگی میرے لیے ناقابل برداشت ہوگئی - ائرفورس کیمپ کی یہ بارکیں لکھنؤ سنٹرل جیل کی ان بارکوں کی یاد دلاتی تھیں جہاں سال ڈیڑھ سال قبل کچھ دنوں تک مجھے رہنا پڑا تھا۔"

"ہاں یہ تو مجھے یاد ہی نہیں تھا" میری بات کاٹتے ہوئے مجید نے کہا "کسی نے مجھے لکھا تھا کہ ایک ہڑتال کے سلسلے میں شفیق نقوی اور تم گرفتار ہو گئے ہو - کتنے دن رہے تھے جیل میں ؟"

"شفیق نقوی تو سیاسی ضرورتوں کے پیش نظر دو تین دن بعد ہی ضمانت پر باہر آ گئے، لیکن میرا تو چالیس دن کا پورا چلّہ ہوگیا - مگر میری یہ جیل یاترا میرے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوئی - یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ لکھنؤ سنٹرل جیل ہی سے میری علمی و ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز ہوا۔"

"وہ کیسے ؟"

"یہ قصہ جنوری ۱۹۴۰ء کا ہے - لکھنؤ پیپر مل میں زور شور کی ہڑتال ہوئی - ہڑتالی مزدوروں کی گرفتاری تو دوسرے ہی دن سے شروع ہو گئی، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آٹھویں دن پولیس نے ہمارے کیمپ پر، جو مل کے پھاٹک کے قریب ہی تھا، چھاپہ مار کر مزدوروں کے ساتھ ساتھ لیڈروں کو بھی گرفتار کر لیا - ہماری گرفتاری بلا وارنٹ ہوئی

تھی، اس لیے ہمیں پہلے کوتوالی لے جایا گیا، جہاں ضابطے کی خانہ پری کی گئی. اس میں تقریباً چار گھنٹے لگ گئے۔

"گرفتاری کے وقت تک ہم میں سے کسی نے بھی کھانا نہ کھایا تھا، اس لیے ہر شخص بھوکا تھا مگر کوتوالی والوں نے اس سلسلے میں ہماری مدد کرنے سے قطعی معذوری ظاہر کی. اسی دوران میں ہمارے کچھ 'ہمدرد' بھی وہاں پہنچ گئے اور انھوں نے گرم گرم پوری کچوری لاکر ہماری مدارات کی.

"پانچ بجے کے قریب ہمیں سنٹرل جیل لے جایا گیا. جیل کے پھاٹک سے متصل ہی جیل کا دفتر تھا، وہیں ہماری "سپردگی" کی کارروائی ہوئی. اس میں کوئی گھنٹہ بھر لگا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد جیل کے اندرونی حصے میں ہمیں لے جایا گیا، اور کئی پھاٹکوں سے گزرنے کے بعد ایک لمبی سی بارک کا آہنی دروازہ ہمارے لیے کھولا گیا، جس میں ستر پچھتر ایسے افراد پہلے سے موجود تھے، جن کے مقدمات زیر سماعت تھے.

"جیل میں ہمارا ورود، جیل کے قاعدوں کے مطابق، ناوقت تھا. اس کی وجہ سے وہاں دو مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ ہم میں سے ہر شخص کے لیے کم از کم دو دو کمبل فراہم کیا جانا ضروری تھا، اور جیل کا اسٹور کیپر اسٹور بند کرکے جا چکا تھا۔ دوسرا کھانے کا مسئلہ تھا، جس کا سلسلہ جیل میں پانچ بجے ختم ہو جاتا ہے اور معاملہ ایک دو کا نہیں، بلکہ بیس بائیس ہڑتالی قیدیوں کا تھا، جن سے جیل کے حکام بھی کچھ نہ

کچھ گھبراتے ضرور ہیں۔ چناں چہ آٹھ بجے کے قریب ہمارے لیے کمبلوں، اور کھانے بھی، انتظام ہو ہی گیا۔

"کھانے میں کوئی ساگ تھا، جو پانی میں ابال دیا گیا تھا۔ روغن یا مسالے کا اس میں نام تک نہیں تھا۔ روٹی موٹی موٹی ادھ کچی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساگ اور روٹی دونوں میں تکلیف دہ حد تک کرکراہٹ تھی۔

"بس یہی؟"، ایک لقمہ منہ میں رکھنے کے بعد ایک نوجوان اور نوعمر رفیق نے سوال کیا، جو لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور نئے نئے سیاسی میدان میں آئے تھے۔

"نہیں"، شفیق نقوی نے، جو ہماری پارٹی کے لیڈر تھے، سنجیدگی سے جواب دیا "اس کے بعد پراٹھے اور کباب بھی آئیں گے"۔ یہ جواب سنتے ہی نوگرفتار رفیق نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

"آپ یہاں کیسے؟"

"جیل کے قاعدے کے مطابق دوسرے دن جب ہمیں سپرنٹنڈنٹ جیل کے سامنے پیش کیا گیا، تو انھوں نے دیکھتے ہی حیرت سے سوال کیا۔ یہ کرنل جعفری تھے، جن سے کانگرس وزارت کے دور میں کئی بار رفیع احمد قدوائی صاحب کے یہاں ملاقات ہو چکی تھی۔ میرے جواب دینے سے پہلے ہی ان کے پیش کار نے ایک فہرست ان کے سامنے رکھتے

ہوئے بتلایا کہ لکھنؤ پیپر مل کی ہڑتال کے سلسلے میں یہ بھی گرفتار ہوئے ہیں۔

"فہرست پڑھنے کے بعد مجھے اور شفیق نقوی کو انھوں نے "بی کلاس" میں رکھے جانے کا حکم دیا۔ لیکن ان کی اس مہربانی سے فائدہ اٹھانا ہم نے مناسب نہ سمجھا۔ کیوں کہ ہمارے باقی پینتیس چالیس ساتھی اگر تنہا رہ جاتے تو ان کی ہمتیں ٹوٹنے اور ان کے معافی مانگنے کا احتمال تھا۔ چناں چہ جعفری صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم نے ان سے درخواست کی کہ ہم سب کو ایک الگ بارک میں رکھا جائے، جس میں جرائم پیشہ حوالاتی نہ ہوں، کیوں کہ ان کی صحبت میں ہمارے مزدور ساتھیوں کے بے راہ رو ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں بھی آگئی اور انھوں نے ہماری درخواست منظور کرلی۔

"اب ہمیں جس بارک میں منتقل کیا گیا وہ زیادہ بڑی نہیں تھی اور نہ جانے کیوں اس کا نام "کتیا بارک" تھا۔ ایک زمانے میں جواہر لال نہرو اور موتی لال نہرو بھی اس بارک میں رہ چکے تھے۔ اسی سے متصل ایک چھوٹا سا احاطہ تھا، جس میں ایک مختصر سی بارک بھی تھی۔ اس میں شہید بھگت سنگھ کے تین ساتھی —— جے دیو کپور، شیو ورما اور ڈاکٹر گیا پرشاد عمر قید کاٹ رہے تھے۔ ان کی بارک میں دن کو ہمارے آنے جانے پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ یہ تینوں

بی کلاس کے قیدی تھے، اور ان کی وجہ سے ہم کو بھی بی کلاس کی کچھ سہولتیں حاصل ہو گئی تھیں مثلاً ہم دو تین آدمی اکثر دن کا کھانا ان ہی لوگوں کے ساتھ کھاتے اور شام کی چائے تو پابندی سے وہیں ملتی رہی۔ ان لوگوں نے اپنے احاطے میں بیڈمنٹن کا کورٹ بھی بنوا لیا تھا۔ سہ پہر کو ہم لوگ بھی بیڈمنٹن میں شریک ہو جاتے۔

"گرفتاری کے وقت میرے ہاتھ میں ایک فلسطینی عیسائی جارج انطونیس کی ضخیم کتاب "دی عرب اویکننگ" (بیداریٔ عرب) تھی، جو اسی روز میرے ہاتھ آئی تھی۔ جیل کی فرصت سے فائدہ اٹھا کر میں نے اس کی تلخیص کر ڈالی۔ جیل سے باہر آنے کے بعد مسودہ لاہور کے ایک مشہور ادبی رسالے کو میں نے بھیجا۔ اڈیٹر نے مسودے کی بے حد تعریف کی، شاید مصنف کی بھی کسی نے اتنی تعریف نہ کی ہو گی۔ لیکن معاوضے کا کوئی ذکر نہیں کیا، جس کا میں نے واضح الفاظ میں مطالبہ کیا تھا۔ اس فرد گذاشت کی طرف میں نے توجہ دلائی تو اڈیٹر نے پہلا ہی نسخہ اور زیادہ فیاضی سے آزمایا۔ تیسری بار جب میں نے یاد دہانی کرائی تو انھوں نے مسودہ بیرنگ واپس کر دیا۔

"میں نے چونکہ تہیہ کر لیا تھا کہ بلا معاوضہ کسی رسالے میں اسے شایع نہ کراؤں گا۔ اس لیے اس کا صرف ایک باب برائے نام معاوضے پر 'نیا ادب' میں شایع ہو سکا اور

باقی حصوں کا بھی اسی طرح شایع ہونا طے پایا۔ اسی اثنا میں ایک دوست نے "نگار" کو آزمانے کا مشورہ دیا۔ یہ تیر نشانے پر بیٹھا، اور پھر اس کی چار قسطیں نگار میں شایع ہوئیں"۔

"تو نیاز صاحب نے معاوضہ دیا تم کو؟" مجید نے حیرت سے سوال کیا۔

"معاوضہ تو دیا ہی نیاز صاحب نے" میں نے جواب دیا "لیکن اس سے سب سے بڑا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ نگار میں اس کی اشاعت نے میرے اندر خود اعتمادی پیدا کی۔ نگار میں کسی نووارد بساطِ ادب کا داخل ہونا آسان نہ تھا —— نیاز صاحب نے میری ہمت افزائی میں بھی بخل سے کام نہیں لیا"۔

"تم کسی کی معرفت گئے تھے ان کے یہاں؟"

"کسی کی معرفت نہیں، بلکہ میں براہ راست گیا تھا"۔

"یار میں نے تو نیاز صاحب کے متعلق عجیب عجیب باتیں سنی ہیں"۔

"میں نے بھی عجیب عجیب باتیں ان کے متعلق سنی تھیں۔ پہلی مرتبہ ڈرتے ڈرتے ان کے پاس گیا تھا۔ یہ قصہ اوائل ۱۹۴۰ء کا ہے۔ ان کے مکان پر پہنچا تو صدر دروازہ اٹکایا ہوا تھا۔ کنڈی کھٹکھٹائی تو جواب میں کسی نے کہا 'اندر آجایئے'، دروازہ کھولا تو سامنے چھوٹا سا صحن اور

اس کی بغل میں ایک، برآمدہ نظر آیا، جہاں کونے میں ایک کاتب بیٹھا تھا۔ نیاز صاحب کے متعلق دریافت کیا تو سامنے کے کمرے کی طرف اس نے اشارہ کر دیا، جس کے دروازے پر چق پڑی تھی۔

"تشریف لائیے" ایک بزرگ نے دیکھتے ہی اندر سے آواز دی۔

کمرے میں داخل ہوا تو ایک صاحب بڑی سی میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ سامنے کتابوں کا انبار لگا تھا۔ میز کے کونے پر بجلی کا ایک لیمپ تھا، جس کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے کی تاریکی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میز کے قریب پہنچ کر میں نے سلام کیا۔

"تشریف رکھیے" ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا "میں ابھی دو منٹ میں فارغ ہوتا ہوں"۔

نیاز صاحب نے دو کی جگہ پر چار پانچ منٹ لے لیے۔ لیکن میں نے اس وقفے کو غنیمت جانا۔ اتنی دیر میں اپنے حواس مجتمع کر لیے اور جب وہ مجھ سے مخاطب ہوئے تو پورا قصہ میں نے تفصیل کے ساتھ سنا دیا۔

"اچھی بات ہے" مسودہ میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے نیاز صاحب نے کہا " آج ہی شام کو آپ کو جواب مل جائے گا"۔

"تو میں شام کو حاضر ہو جاؤں گا"۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے" انھوں نے قطعیت سے

جواب دیا "میرا آدمی صدیق بک ڈپو خط دے آئے گا۔ وہیں کا پتا آپ نے لکھا ہے نا؟"

"شام کو صدیق بک ڈپو گیا، تو میرے نام کا ایک بڑا سا لفافہ وہاں رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرا پہلا تاثر مایوس کن تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ نیاز صاحب نے مسودہ واپس کر دیا ہے۔ لفافہ کھولا تو مسودے کے ساتھ ایک لمبی سی سلپ پر کاروباری انداز کی مختصر سی تحریر تھی۔ مضمون کے متعلق کوئی رائے نہیں تھی۔ بس اتنا لکھا تھا کہ مضمون بالاقساط شایع ہو جائے گا۔ معاوضہ فی الحال آٹھ آنے فی صفحہ دیا جا سکے گا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی تھی کہ منظور ہو تو دوسرے دن گیارہ بجے تک مسودہ دفتر پہنچا دیا جائے، تاکہ اگلے شمارے میں اس کی پہلی قسط شایع کی جا سکے۔

"معاوضہ میری توقع سے کم تھا، لیکن فیصلہ کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ دوسرے دن وقت مقررہ پر میں گیا اور بے چون و چرا مسودہ نیاز صاحب کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے کاتب کو بلایا اور مسودہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا "دیکھیے یہ کتنے صفحے کا ہوگا؟" کاتب نے سطروں کا حساب لگانے کے بعد ساٹھ صفحات کا تخمینہ بتایا۔ نیاز صاحب نے میز کی دراز سے چک بک نکالی اور تیس روپے کا چک لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ تھا نیاز صاحب کا اور میرا پہلا سابقہ یا پہلا معاملہ۔ اس کے

بعد بھی ان کا یہی دستور رہا کہ جب بھی کوئی مضمون میں نے خود یا ان کی فرمایش پر لکھا، معاوضے کا چک انھوں نے اسی وقت کاٹ دیا۔ نقد پیسے کبھی نہیں دیے۔ اور ادھار کا معاملہ بھی کبھی نہیں رکھا۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد جب انھیں میرے ذہنی رجحانات کا اندازہ ہو گیا تو کھل کر باتیں کرنے لگے۔ اکثر خود ہی موضوع کا تعین کر کے مضمون لکھنے کی فرمایش بھی کرتے۔

"اسے اپنا لیجیے،" ایک انگریزی رسالے کا تراشا میرے حوالے کرتے ہوئے ایک بار نیاز صاحب نے کہا۔

"یہ فن مجھے نہیں آتا" میں نے جواب دیا "کہیے تو ترجمہ اس کا کر دوں۔"

"اچھی بات ہے، ترجمہ کر دیجیے۔"

"دو مہینے بعد وہی مضمون جب "نگار" میں "ادارے" کے نام سے شایع ہوا، تو اس کا انداز بیان اس درجہ بدلا ہوا تھا کہ پڑھتے وقت کچھ دیر تک میں محسوس نہ کر سکا کہ یہ وہی مضمون ہے، جس کا میں نے ترجمہ کیا تھا۔

"نیاز صاحب کی ہدایت کے مطابق یا ان کے مشورے سے میں نے بعض طویل مضامین ایسے لکھے جو کسی مصلحت کی بنا پر وہ شایع نہ کر سکے یا اس کے کچھ حصے ہی شایع کیے لیکن ایسے مضامین کا بھی معاوضہ انھوں نے مسودے کے صفحات کے مطابق ہی پیشگی ادا کیا، اور غیر شایع شدہ حصوں کا معاوضہ

کسی دوسرے مضمون کے حساب میں وضع نہیں کیا۔
"دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد برطانوی پارلی منٹ کے ایک لیبر ممبر" زلیاکس" کی ایک کتاب "لائٹ آن ماسکو" لندن سے شایع ہوئی، جس پر برطانیہ کی خارجہ پالیسی پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی۔ نیاز صاحب کی اجازت سے میں نے اس کی تلخیص کرڈالی جو نگار کے اسی پچاسی صفحات کی تھی۔ مسودہ میں نے ان کے حوالے کیا اور انھوں نے حسب دستور معاوضہ ادا کردیا۔ اس کے بعد میں اتفاقاً لکھنؤ سے باہر چلا گیا اور ڈھائی تین مہینے بعد واپسی ہوئی۔ نگار کا تازہ شمارہ دیکھا تو پہلی قسط "اہم انکشافات" کے عنوان سے، میرے نہیں ادارے کے نام سے تھی[۱] لیکن دوسری قسط میرے ہی نام سے شایع[۲] ہوئی۔ مگر اس میں نیاز صاحب نے کمال یہ کیا کہ مسودے کے ساٹھ پینسٹھ صفحات کو کانٹ چھانٹ کر نگار کے نو صفحات میں سمو دیا اس سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ مضمون کے آخر میں ایک طویل نوٹ کا بھی اضافہ کیا جس میں اصل کتاب پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی
"آپ نے تو غضب کردیا نیاز صاحب!" لکھنؤ لوٹنے کے بعد پہلی ملاقات میں احتجاجاً میں نے کہا "میرے مضمون کا تو بھرکس ہی نکال دیا آپ نے۔ رہی سہی کسر آپ کے نوٹ نے پوری کردی"۔

---

[۱] نگار: جولائی ۱۹۴۰ء [۲] نگار: ستمبر ۱۹۴۰ء

"کیا کرتا،" نیاز صاحب نے بے بسی سے جواب دیا "پہلی قسط کی اشاعت کے ساتھ ہی گورنمنٹ آف انڈیا کا عتاب نامہ آ گیا۔"

"نیاز صاحب کا یہ بیان یقیناً سچ تھا۔ میری ایک اور طویل تلخیص بھی حکومت کی پالیسی کی نذر ہو گئی، جس کی صرف پہلی ہی قسط "روسی نظامِ حکومت پر تبصرہ" کے عنوان سے شایع ہو سکی۔[1]

"جولائی ۱۹۴۱ء میں نیاز صاحب نے نگار کا جنگ نمبر شایع کرنے کا اعلان کیا اور اس کے لیے ایک طویل مضمون لکھنے کی مجھ سے فرمایش کی، جس میں پہلی جنگ عظیم کے اختتام سے لے کر دوسری جنگ کے آغاز تک کے بین الاقوامی حالات پر سیر حاصل تبصرہ ہو۔

"یہ تو خاصا لمبا کام ہے" ان کی فرمایش سن کر میں نے کہا اور مضمون بھی کافی طویل ہوگا۔"

"اس کی فکر نہ کیجیے" انھوں نے جواب دیا "مضمون جتنا طویل بھی ہو، چھپ جائے گا اور معاوضہ بھی دونا ملے گا، لیکن شرط یہ ہے کہ پندرہ دن کے اندر تیار ہو جائے۔"

"رات دن ایک کر کے مضمون معینہ مدت کے اندر میں نے نیاز صاحب کے حوالے کر دیا۔ اس کی تیاری کے سلسلے میں

---

[1] نگار: جولائی ۱۹۴۰ء

اپنے اس مضمون سے بھی میں نے بہت مدد لی، جو عربوں کی سیاسی بیداری، کے عنوان سے 'نگار' ہی میں بالاقساط شایع ہوا تھا۔ اس کے بعض کام کے طویل اقتباسات لفظ بہ لفظ میں نے اس مضمون میں بھی شامل کر دیے۔ وہ مضمون بھی چوں کہ میرا ہی تھا اس لیے حوالے دینا میں نے غیر ضروری سمجھا۔ اس جنگ نمبر کے لیے نیاز صاحب نے ایک اور مضمون مجھ سے لکھوایا۔ لیکن جب یہ نمبر آیا تو میرا طویل مضمون "داستانِ جنگ" کے عنوان سے بہ طور مقدمہ کے ملاحظات کی جگہ پر ادارے کے نام سے شایع ہوا۔[1] دوسرے مضمون کا بھی یہی حشر ہوا۔[2] لیکن سب سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اسی نمبر میں ایک مضمون میرے نام سے تھا جو میرا لکھا ہوا نہیں تھا۔[3]

"اچھا یہ بتلاؤ" نیاز صاحب کی داستان سے اکتا کر مجید نے گفتگو کا موضوع بدلا "انڈین ائر فورس سے چھلانگ لگا کر انڈین آرمی پبلک ریلیشنز میں کیسے پہنچے؟"

"یہ بھی دلچسپ قصہ ہے" میں نے شروع کیا "دہلی کے ائر فورس کیمپ میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد معلوم ہوا کہ کیمپ

---

[1] نگار: اگست ۱۹۴۰ء [2] نگار: اگست ۱۹۴۰ء 'نازی حکومت اور مزدور'
[3] نگار: اگست ۱۹۴۰ء 'سائنس اور جنگ'۔

سے باہر رہنے کی بھی اجازت مل سکتی ہے۔ میں نے اس کے لیے درخواست دی، جو منظور ہو گئی۔ اب میں قرول باغ منتقل ہو گیا، جہاں جامعہ ملیہ کی چھوٹی سی تعلیمی بستی میں میرے کچھ ہم وطن دوست رہتے تھے۔

"قرول باغ سے دفتر تک اکثر و بیشتر پیدل جانا پڑتا، جو سکریٹریٹ کے جنوبی پھاٹک ــــ ساؤتھ بلاک ــــ کی پشت پر ہے۔ واپسی کی بھی یہی شکل ہوتی۔ لیکن قرول باغ میں جو ذہنی آسودگی مجھے حاصل ہوئی تھی، اس کے مقابلے میں یہ زحمت ہیچ تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ تھا کہ دفتر سے واپسی کے بعد، اور چھٹیوں کے دن، ائر فورس کی وردی اتار کر عام انسانوں کے لباس میں گھومنا پھرنا نصیب ہوتا، اگرچہ یہ قاعدے کے خلاف تھا۔ قرول باغ کی علمی فضا اور وہاں کے ادبی ماحول نے جلد ہی اس ذہنی زنگ کو بھی صاف کر دیا جو پانچ چھ مہینوں کی فوجی زندگی میں لگ گیا تھا۔"

"میں انڈین آرمی پبلک ریلیشنز میں جانے کی کوشش کر رہا ہوں" قرول باغ ہی کے دوران قیام میں کسی چھٹی کے دن جامع مسجد جاتے ہوئے، ایک دوست نے مجھے بتایا۔

"یہ کون سا محکمہ ہے؟" میں نے حیرانی سے سوال کیا "میں نے تو آج تک اس کا نام بھی نہیں سنا ہے۔"

"یہ اخبار اور ریڈیو کا فوجی محکمہ ہے" انھوں نے وضاحت کی "اور اس کے سلسلے میں ہندستان سے باہر جانا ہوتا ہے۔ ایک صاحب ہیں میر مرتضیٰ علی، وہ اس محکمے میں سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ ان ہی کی معرفت میں کوشش کر رہا ہوں۔"

"یہ کام تو یار میں تم سے اچھا کر سکتا ہوں" میں نے کہا "اگر کہو تو میں بھی کوشش کروں کہ ائرفورس سے میرا تبادلہ بھی انڈین آرمی پبلک ریلیشنز میں ہو جائے۔"

"وہاں تو بہت جگہیں ہیں" میرے دوست نے خندہ پیشانی سے جواب دیا "ضرور کوشش کرو۔ ممکن ہے کہ ہم دونوں ہی کا کام بن جائے۔"

"یہ میر مرتضیٰ علی ہیں کون بزرگ؟"

"دہلی ہی کے ہیں" انھوں نے جواب دیا "اور جامع مسجد ہی پر رہتے ہیں۔ آدمی بے حد شریف ہیں۔ اگر چاہو تو اسی وقت چلو۔ جامع مسجد کے جنوبی دروازے کی طرف ایک گلی چوڑی والان کو جاتی ہے، جسے چھتہ شیخ منگو کہتے ہیں۔ وہیں میر صاحب کا مکان ہے۔"

ہم دونوں میر صاحب کے مکان پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ مغرب کی نماز پڑھنے پڑوس کی مسجد میں گئے ہیں۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ادھیڑ عمر کے ایک بزرگ سامنے سے آتے نظر آئے، جو جسم اور قد کے اعتبار سے مسٹر جناح معلوم ہوتے تھے۔ میرے دوست نے بتلایا یہی میر مرتضیٰ علی صاحب

ہیں۔ تعارف کے بعد میں نے حرف مطلب بیان کیا۔

"آپ کا کام ہونا مشکل ہے" انھوں نے صفائی سے جواب دیا "ائر فورس سے آرمی میں تبادلہ ہونا تقریباً ناممکن ہے۔"

"مگر کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے" میں نے اصرار کیا۔

"میں امکان بھر زور لگاؤں گا" انھوں نے جواب دیا "کل گیارہ بجے آپ آجایئے میرے دفتر، جو آپ کے دفتر سے متصل ہی ہے۔"

دوسرے دن گیارہ بجے میں چپکے سے دفتر سے کھسک لیا۔ میر صاحب نے صاحب سلامت کے بعد کوئی بات نہیں کی، بلکہ لے جاکر مجھے فیض احمد فیض کے سامنے کھڑا کر دیا، جو اس وقت 'میجر فیض' تھے۔ میر صاحب نے تعارف کرایا۔ پھر میں نے اپنے صحافتی تجربات بیان کیے۔

"یہ آپ ائر فورس میں کیسے پھنس گئے" میری رام کہانی سننے کے بعد فیض نے سوال کیا۔

"دام ہم رنگ زمیں بود، گرفتار شدیم" میں نے جواب دیا۔

"یہ تھی میجر فیض سے میری پہلی ملاقات۔ انھوں نے بھی وہی جواب دیا جو میر صاحب نے دیا تھا، ساتھ ہی انھوں نے بھی کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ پھر میں ستو باندھ کر ان کے پیچھے پڑ گیا۔"

"اور اس طرح سے تم انڈین ائر فورس سے انڈین آرمی پبلک ریلیشنز میں پہنچ گئے" مجید نے کہا۔

"ہاں ہوا تو یہی" میں نے جواب دیا "لیکن جس آسانی سے تم نے کہہ دیا، اس آسانی سے یہ کام ہوا نہیں۔ اس دوڑ دھوپ میں

چھ مہینے لگ گئے۔"

یہ داستان میں بیان کر ہی رہا تھا کہ مجید نے فرش ہی پر لیٹے لیٹے خراٹے لینے شروع کر دیے۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ دوسرے دن صبح کو آنکھ کھلی تو سات بج چکے تھے۔ مجید بدستور سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی معصومانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جیسے بچوں کی طرح پرستان کے خواب دیکھ رہا ہو۔ اسے جگانا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ جلدی جلدی غسل کر کے دفتر کی راہ لی، جو آٹھ بجے سے شروع ہوتا تھا۔

دفتر پہنچنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرے ایک رفیق بیمار ہو گئے ہیں، اور ان کی جگہ پر مجھے آج تہران سے باہر ایک کیمپ تک جانا ہے، جہاں سالانہ تقریب کے موقع پر کھیل کود کے مقابلے اور دوسرے تفریحی پروگرام ہوں گے۔ خیال تھا کہ اسی دن شام تک لوٹ آؤں گا، لیکن واپسی دوسرے دن ہوئی۔ شام کو دفتر سے اٹھ کر سیدھا مجید کے دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ مجید تو ۱۰ اگست کی شام ہی کو آبادان چلا گیا۔

چند روز کے بعد مجھے مجید کا ایک مختصر سا خط ملا، جس میں اس نے اطلاع دی تھی کہ ملازمت سے اس نے استعفا دے دیا ہے اور وطن واپس جا رہا ہے۔

حیف در چشم زدن

تہران اتحادی طاقتوں کی ترو ینی تھا، جہاں روسی، امریکی اور برطانوی فوجیں کثیر تعداد میں جمع ہو گئی تھیں۔ روس کو جو فوجی امداد امریکا دے رہا تھا، اس کا بیش تر حصہ ایران ہی کے راستے سے روسی محاذ جنگ تک بہ آسانی پہنچایا جا سکتا تھا۔ اسی نے اتحادیوں کے نقشہ جنگ میں ایران کو بڑی اہمیت دے دی تھی۔

جنگ نے ایران کی بھی معاشی زندگی میں شدید عدم توازن پیدا کر دیا تھا۔ یہ حالات کم و بیش ہر ملک میں تھے، لیکن ایران میں اس کا جو روپ نظر آیا وہ انتہائی بھیانک تھا۔ تہران کا شمار اس وقت دنیا کے تین گراں ترین شہروں میں تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں شہر مشرق ہی کے تھے — پہلا چن کنگ، دوسرا انقرہ اور تیسرا تہران۔ تہران کی گرانی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں اوسط درجے کے ہوٹلوں میں ایک وقت

کا معمولی کھانا پچیس تیس تومان سے کم کا نہیں ہوتا تھا۔ برٹش کونسل کا "خانہ پیروزی" (وکٹری ہاؤس) ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں ایک وقت کا کھانا — لنچ یا ڈنر — پانچ تومان میں مل جاتا تھا۔ لیکن اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے تھے جو برٹش کونسل کے ممبر یا فوجی تھے۔

تہران کے مضافات میں، شہر سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر، شمران کا خوش نما علاقہ ہے، جو تہران سے نسبتاً بلند، کوہ البرز کے دامن میں واقع ہے۔ یہیں سعد آباد کا وہ تاریخی محل ہے، جہاں ۱۹۳۷ء میں رضا شاہ پہلوی کی تحریک پر افغانستان، عراق، ترکی اور ایران کے سربراہوں کی کانفرنس ہوئی تھی اور ان لوگوں نے دوستی اور تعاون کے ایک معاہدے پر دستخط کیے تھے جو "معاہدۂ سعد آباد" کے نام سے مشہور ہوا تھا اور جسے خوش فہمی سے اسلامی بلاک کی تشکیل کا پیش خیمہ سمجھا گیا تھا۔ محل سعد آباد کے نواح میں میرے اولین ایرانی شناسا آقائے جعفر زادہ کا ایک خوب صورت سا "جعفر ولا" بھی ہے۔ ایک اتوار کو دن کا کھانا میں نے ان کے یہاں کھایا۔ سہ پہر کو منیزہ اور عباس چائے پینے کے لیے مجھے دربند ہوٹل لے گئے، جو شمران کا خوب صورت ترین ہوٹل سمجھا جاتا ہے۔ چائے کے ساتھ بسکٹ، پیسٹری اور کچھ پھل بھی تھے۔ بعد میں ہم لوگوں نے آئس کریم بھی کھائی، جو یقیناً لذیذ تھی لیکن جب بل آیا، تو وہ میری توقع سے کہیں زیادہ، ستر تومان کا تھا۔

تہران میں روسی فوجی بھی بہت تھے۔ مگر شہری زندگی سے وہ یک سر الگ تھلگ رہتے۔ پیٹھ پر اسٹین گن لادے، سر جھکائے سڑکوں پر چلتے پھرتے تو وہ ضرور دکھائی دیتے، لیکن ہوٹلوں، رستورانوں اور تفریح گاہوں میں وہ بالکل نظر نہ آتے۔ روسی فوجیوں کی طرح روسی لٹریچر کی بھی تہران میں بڑی فراوانی تھی۔ ٹُودکس کی بڑی سی دوکان کے علاوہ فٹ پاتھ پر بھی جگہ جگہ تودہ (کمیونسٹ) پارٹی کا لٹریچر کھلے بندوں بکتا تھا۔ جس ایرانی سے بھی بات کیجیے، اس کی جیب میں پارٹی ممبرشپ کا کارڈ ضرور ہوتا، جسے بڑے فخر سے آپ کے سامنے پیش کرکے وہ کہتا "آغا جونم (جانم) من ہال تودہ ہستم"۔

تہران میں تودہ لٹریچر کی فراوانی ہی کا شاید یہ نتیجہ تھا کہ کچھ ہندستانی فوجی بھی تہران کے دوران قیام میں کمیونزم سے قریب آئے اور چند ہندستانیوں نے روسی زبان بھی سیکھی اور اس میں مہارت پیدا کی۔ بعض روسیوں نے بھی تہران کے دوران قیام میں فارسی سیکھی۔

خیابان سعدی کی ایک فارسی کتابوں کی دوکان میں ایک روسی میجر سے میری ملاقات ہوئی، جو بڑی روانی سے فارسی اور اٹک اٹک کر انگریزی بھی بول لیتا تھا۔ کچھ دیر تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے، پھر اپنی قیام گاہ پر چلنے کی اس نے مجھے دعوت دی، جو قریب ہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی کسی کیمپ میں رہتا ہوگا، لیکن جب وہاں پہنچا، تو وہ کیمپ نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا فلیٹ نکلا، جس میں

اس کی بیوی اور چار سالہ لڑکی بھی تھی۔

"یہ تمہارے چچا ہیں" بچی سے تعارف کراتے ہوئے میجر نے کہا۔

"یہ میرے چچا نہیں ہو سکتے" لڑکی نے بے ساختہ جواب دیا "یہ تو کالے ہیں۔"

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ میجر کی بیوی نے خشک گوشت، ڈبل روٹی، مکھن، پنیر اور پھل کے ساتھ ووڈکا کی بوتل بھی لاکر ہمارے سامنے رکھ دی۔ رات کا کھانا مجھے ایک دوسری جگہ کھانا تھا، اس لیے میں نے معذرت کی۔ لیکن میاں بیوی کے اصرار سے کچھ نہ کچھ کھانا ہی پڑا۔ میجر نے مجھے بتایا کہ ملنے جلنے میں روسی پیش قدمی نہیں کرتے، لیکن اگر کوئی شخص ان کی طرف بڑھے تو وہ اُسے خوش آمدید بھی کہتے ہیں۔

روسیوں کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کسی روسی سپاہی کو سڑک پر نہ تو مدہوش پایا گیا اور نہ کسی عورت کو چھیڑتے یا پیچھا کرتے دیکھا گیا۔ غالباً اسی نے عام ایرانیوں کے دلوں میں ان کے لیے عزت و احترام کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

امریکی فوجیوں کا حال روسیوں کے بالکل برعکس تھا۔ ہوٹلوں، تفریح گاہوں اور ناچ گھروں میں ان کا جمگھٹا رہتا۔ روپیہ وہ پانی کی طرح خرچ کرتے۔ ان کی بدولت سارے ایران کی طوائفیں اور آوارہ منش عورتیں تہران میں سمٹ آئی تھیں، جو امریکی کیمپوں کو جنت سے تشبیہ دیا کرتی تھیں۔ سر شام ان کا ایک طوفان سا سڑکوں پر امنڈ آتا۔ کوئی راہ چلتا فوجی ان سے اگر ملتفت نہ ہوتا تو وہ خود اسے

چھیڑتیں اور اس کے گلے میں باہیں ڈال دیتیں۔ ان کی وضع قطع عام ایرانی عورتوں سے چوں کہ مختلف نہ ہوتی اس لیے راہ چلتی شریف عورتیں بھی اکثر فوجیوں کی چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بن جاتیں۔ چناں چہ تہران کی شریف خواتین نے غروب آفتاب کے بعد گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔

انگریز فوجیوں کی حالت امریکنوں نے تباہ کر رکھی تھی۔ سڑکوں پر وہ بھی بہ کثرت نظر آتے اور عورتوں کو چھیڑنے چھاڑنے میں وہ بھی امریکنوں سے کم نہ تھے۔ لیکن ان کے پاس ایک تو پیسے کی وہ فراوانی نہ تھی، جس کا امریکی فوجی مظاہرہ کیا کرتے تھے، دوسرے امریکنوں نے انگریزوں کے اندر یہ احساس کم تری بھی پیدا کر دیا تھا کہ اس جنگ نے برطانیہ کو امریکی نوآبادی بنا دیا ہے۔

انگریزوں کے لیے امریکنوں نے "انتالیسویں ریاست" کی پھبتی وضع کی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ ریاستہائے متحدہ امریکا کی اڑتالیس ریاستوں میں اب انگلستان کا بھی اضافہ ہو گیا ہے جو وہاں کی انتالیسویں ریاست ہے۔ انگریز فوجی اس پھبتی کو سنتے ہی دُم دبا کر بھاگتے۔

انگریزوں کے ساتھ امریکنوں کا ہتک آمیز برتاؤ دیکھ کر ایرانی، اور ہندستانی بھی، دل ہی دل میں بہت خوش ہوتے۔ اس جنگ سے پہلے بھی ایران میں انگریزوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے سیاسی و معاشی اسباب تھے۔ ایران کی قومی دولت "نفت" (تیل) پر انگریزوں کا پورا قبضہ تھا۔ اس کے منافع کا

بہت تھوڑا حصہ ایران کو ملتا، اور بڑا حصہ برطانیہ کی جیب میں جاتا۔ تیل کی اجارہ داری کو برقرار رکھنے اور اس کی حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ سیاسی اعتبار سے بھی ایران کا اقتدار ان ہی کے ہاتھ میں رہے۔

ایرانی تیل کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے اور اس کا دھارا اپنی طرف موڑنے کے لیے جرمنی بھی بے تاب تھا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ایران میں برطانیہ و جرمنی کی رقابت شباب پر تھی۔ رضا شاہ اور ان کی حکومت کی ہمدردیاں جرمنی کے ساتھ تھیں، لیکن ہٹلر کے لیے ایران تک پہنچنا ممکن نہ تھا، اس لیے رضا شاہ نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا اور انگریزوں نے بھی اسے غنیمت جانا۔ لیکن جب ہٹلر نے روس پر حملہ کیا اور اتحادیوں کو روس کا حلیف بننا پڑا تو صورت حال بہت نازک ہوگئی۔ اس وقت روس کو جنگی امداد ایران اور آذربائجان ہی کی راہ سے بہ حفاظت تمام پہنچائی جا سکتی تھی۔ مگر رضا شاہ نے ایران کو رسد رسانی کی اتحادی شاہراہ بنانے سے انکار کر دیا۔ اسی بنا پر انھیں اس تخت سے دست بردار ہونا پڑا جو انھوں نے خود اپنی قوت اور تدبر سے حاصل کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ اور روس کی فوجوں نے وقتی طور پر ایران پر قبضہ کر کے روس کے محاذ جنگ تک امداد پہنچانے کی راہیں محفوظ کر لیں۔

تہران انگریزوں کے زیر اقتدار تھا، بلکہ عملاً وہاں برطانوی سفارت خانے ہی کی حکومت تھی، عام شہری قوانین کا بھی انگریزوں

پر اطلاق کرنے کی کسی ایرانی کو ہمت نہیں ہوتی تھی۔ شمران کے میدانِ تجریش میں ایک موٹر غلط جگہ پر کھڑی تھی۔ اس علاقے کی کلنتری (تھانہ) کے سپاہی نے گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا۔ بعد میں اس نے دیکھا کہ گاڑی کے انجن پر ایک جھنڈا بھی ہے، جس پر خول چڑھا ہے۔ خول اتار کر اس نے دیکھا اور "مال انگلیس است" کہتا ہوا پیچھے ہٹا اور نوٹ بک میں اس نمبر کو قلم زد کر دیا۔

ایران میں جو برطانوی فوجیں تھیں ان میں اکثریت ہندستانیوں کی تھی، جو رسد رسانی کی شاہراہوں کی پاسبانی اور رسل و رسایل کی دیکھ ریکھ کے علاوہ فوجی ساز و سامان روسی محاذِ جنگ تک پہنچانے کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ ہندستانی سپاہیوں نے انتہائی نامساعد موسمی حالات میں یہ خدمت بڑی ہمت اور تن دہی سے انجام دی۔

ہندستانی فوجیوں کی روش روسیوں جیسی تو نہیں تھی، لیکن امریکنوں سے وہ بہت مختلف تھے۔ ان میں نہ تو امریکنوں جیسا چھچھورا پن ہی تھا، اور نہ ان کی جیسی جنسی بے راہ روی۔ ایرانیوں کے دلوں میں ان کے لیے وہ نفرت بھی نہ تھی، جو انھیں انگریزوں سے تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ برطانوی اقتدار کا آلۂ کار ہونے کی وجہ سے ہندستانیوں کو بھی عزت و احترام کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ عام طور پر ایرانی اگرچہ اس کا اظہار نہ کرتے، تاہم کبھی کبھی یہ چیز سطح پر آہی جاتی۔

ایک مرتبہ کوئی ایرانی رات کے وقت ٹیلیفون کے تار چوری

کی نیت سے کاٹ رہا تھا، ایک انگریز فوجی پہرے دار نے اسے گولی کا نشانہ بنایا۔ مشہور یہ ہوا کہ کسی ہندستانی نے ایک ایرانی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ تہران کے اخبارات نے اس قصے کو بڑے غم و غصے کے ساتھ اچھالا اور ہندستانیوں کو خوب صلواتیں سنائیں لیکن اس قصے کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ سمجھ دار ایرانیوں نے اپنے اخبارات کی روش کے خلاف احتجاج کیا۔ احتجاج کرنے والوں میں ایران کے مقبول ترین شاعر آقائے ملک الشعرائے بہار بھی تھے۔

اس نوع کے واقعات کے باوجود ہندستانی فوجیوں اور ایرانیوں کے تعلقات مجموعی طور پر خوش گوار تھے۔ امریکنوں اور انگریزوں کے برعکس ایرانی گھروں میں ان کی آمد و رفت بھی تھی۔ ہندستانی فوجی ٹوٹی پھوٹی فارسی بھی بولنے لگے تھے، اور جن علاقوں میں ہندستانی فوجیں تعینات تھیں، وہاں کے ایرانی ہندستانی بولی سے بھی آشنا ہو گئے تھے۔

تہران میں ہندستانی شہری بھی خاصی تعداد میں ہیں، جو ایک مدت سے وہاں رہتے چلے آرہے ہیں۔ ان میں سے بیش تر پنجابی اور کم تر پارسی ہیں۔ کچھ ایسے ہندستانی بھی ملے جنھوں نے وہیں شادی بیاہ کر کے ایرانی شہریت اختیار کر لی ہے۔ یہ سب کے سب تجارت پیشہ ہیں۔ ہندستانی پارسیوں کی ایک انجمن بھی ہے جو اپنے ہم وطن فوجیوں کی خاطر و مدارات کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔

برطانوی سفارت خانے سے بھی چند ہندستانی وابستہ تھے، جن میں ہندستانی شعبے کے افسر اعلیٰ میجر غضنفر علی نقوی خصوصیت سے

قابل ذکر ہیں، جو اپنی انسانی خوبیوں کی وجہ سے ہندستانیوں ہی میں نہیں بلکہ ایرانیوں میں بھی خاصے مقبول و متعارف تھے۔ ان کا تعلق فوج سے نہیں بلکہ انڈین پولیس سروس سے تھا اور عارضی طور پر انھیں فوجی عہدہ دے دیا گیا تھا۔ شعر و ادب کا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ ہندستانی موسیقی کے بڑے رسیا اور پرکھیا تھے۔ فارسی بہت اچھی بولتے تھے۔

ایک دن گیارہ بجے کے قریب فوجی ہیڈکوارٹر نے ٹیلیفون سے اطلاع دی کہ آج تین بجے ایک ہندستانی ڈی، آئی، پی ہوائی جہاز سے تہران پہنچ رہے ہیں۔ تین چار دن قیام کریں گے۔ ان کے دوران قیام میں ہمارے دفتر کے کسی نمایندے کو ان کے ساتھ رہنا ہے۔ تفصیلات ہیڈکوارٹر سے زبانی معلوم کی جائیں۔ جنگ کے زمانے میں اہم لوگوں کی آمد اور روانگی بڑی سختی سے صیغۂ راز میں رکھی جاتی تھی اور متعلقہ لوگوں کو بھی اس کی اطلاع عین وقت پر دی جاتی تھی۔

ہیڈکوارٹر پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ڈی، آئی، پی سر ہومی مودی ہیں، جو ہندستانی جوانوں سے ملنے آرہے ہیں۔ لیکن ان کے تہران پہنچنے کے بعد، خود ان ہی کے مشورے سے، جو پروگرام بنا، اس میں ہندستانی جوانوں سے ملنے یا ان کے کیمپوں کا دورہ کرنا شامل نہیں تھا۔ سرکاری وغیر سرکاری دعوتوں میں کچھ ہندستانی افسروں سے ان کی ملاقات ضرور ہوئی، لیکن کسی موقع پر بات چیت رسمی گفتگو سے آگے نہ بڑھ سکی۔ تین دن تک میرا بیش تر وقت ان ہی کی مصاحبت میں گزرا،

لیکن میں نے کسی سے بھی ہندستانی مسایل پر ان کو گفتگو کرتے نہیں دیکھا۔

سرہومی مودی کی روانگی کے کچھ ہی دنوں بعد ایک وی، آئی، پی صاحب اور تشریف لائے، جن کی آمد کے سلسلے میں مجھے کرمان شاہ جانا پڑا، جو جنوب مغربی ایران میں واقع ہے۔ یہ سفر جیپ سے گیارہ بارہ گھنٹے میں طے ہوا۔ اور کرمان شاہ پہنچنے کے بعد ہی یہ معلوم ہو سکا کہ یہ وی، آئی، پی ہندستانی فوج کے کمانڈر انچیف سرکلاڈ آرکن لک ہیں۔

ہندستانی فوجی یونٹیں جو کرمان شاہ میں اور اس سے آگے بڑھ کر ایران و عراق کی سرحد پر قصر شیریں اور خانقیں کے مقام پر متعین تھیں، ان کا معائنہ کرنے کے بعد سرکلاڈ آرکن لک نے ان مقامات پر ہندستانی جوانوں کے سامنے اردو میں تقریریں کیں۔ ان کی زبان نہایت صاف اور شستہ تھی۔ اس سے زیادہ حیرت ناک ان کا لب و لہجہ تھا۔ میں تو ان کا منہ تکتا رہ گیا۔

ان کی تقریروں کا انداز بتلا رہا تھا کہ ہندستانی جوانوں کی ذہنی بے اطمینانی سے وہ بے خبر نہیں ہیں، اور انھیں وہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ان کے وطن کی آزادی اب دور نہیں ہے۔ انھوں نے اس پہلو پر خصوصیت سے زور دیا کہ "نئے ہندستان کو بنانے اور سنوارنے کی ذمہ داری ان فوجیوں پر بھی عاید ہوگی، جو فوجی خدمات سے سبک دوش ہونے کے بعد جلد ہی فوجی سے شہری بننے والے ہیں۔"

تہران اور اس کے مضافات کے قدرتی مناظر کی دل کشی و دل فریبی کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جنھوں نے تہران کو دیکھا ہے، جس کی سڑکوں کے اکثر گوشوں سے کوہ دماوند کی بلند و بالا چوٹیاں، کہیں سے گھورتی اور کہیں سے جھانکتی نظر آتی ہیں، جن کی بلندی دیکھ کر ایرانیوں کا سر افتخار بلند تر ہو جاتا ہے، اور جن کی طرف اشارہ کر کے اکثر ایرانیوں نے سوال کیا:

"اتنا اونچا کوئی پہاڑ تمھارے دیس میں ہے؟"

"ہمارے ملک میں تو دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہے۔"

اس جواب سے ہر مخاطب کو حیرت ہی نہیں ہوئی، بلکہ اسے باور کرنے پر بھی وہ اپنے کو مشکل ہی سے آمادہ کر سکا۔ ہندستان کے بارے میں ایرانیوں کی معلومات حد درجہ محدود تھیں۔ دانش گاہ ایران کے پوسٹ گریجویٹ کلاس کے ایک طالب علم نے، جو کسی ضرورت سے میرے دفتر آیا تھا، پوچھا:

"تمھاری یہاں کوئی یونیورسٹی بھی ہے؟"

ایرانی نوجوان کے اس سوال کو میں پی گیا، اور کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کمرے میں اس وقت جتنی چیزیں بھی مجھے نظر آئیں — بلب اور پنکھوں سے لے کر کاغذ اور روشنائی تک — ایک ایک کے متعلق پوچھا کہ یہ تمھارے ملک میں بنتی ہیں یا باہر سے آتی ہیں۔ قالین اور سگریٹ کے علاوہ ہر چیز کے متعلق اس نے یہی کہا کہ باہر سے آتی ہے۔

"یہ سب چیزیں ہم اپنے ملک میں بناتے ہیں۔"

"بخدا دروغ می گوئی" کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے بے اختیار کہا۔

"ابھی تم نے سوال کیا تھا" اس کی دروغ گوئی کے بہتان کو نظرانداز کرتے ہوئے میں نے کہا "کہ ہمارے ملک میں کوئی یونیورسٹی بھی ہے؟ ہندستان میں گیارہ صوبے ہیں۔ جس صوبے کا میں رہنے والا ہوں، اس کا رقبہ ایران سے شاید کم ہی ہو، لیکن وہاں چار یونیورسٹیاں ہیں"۔

اس جواب کے ساتھ اسٹیٹسمین ایر بک میں نے ان کے سامنے رکھ دی، جو میری میز ہی پر رکھی تھی اسے دیکھ کر وہ خاموش تو ہو گیا لیکن اس کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ اب بھی اسے یقین نہیں آیا ہے۔

ہندستان کے قدیم و جدید فارسی ادب سے بھی ایرانی بڑی حد تک بے خبر نظر آئے، اور جو کچھ واقف بھی تھے، وہ اسے قابل اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ اگرچہ اس سلسلے میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جدید ایرانی شعرا کے کلام کا جو انتخاب محمد اسحاق (کلکتہ یونیورسٹی) نے "شعرائے ایران در عصر حاضر" کے نام سے دو جلدوں میں شایع کیا ہے، ایران میں بھی خاصا مقبول ہے، اور عام طور پر کتب فروشوں کی دوکانوں پر مل جاتا ہے۔

ہندستان کے فارسی گو شعرا میں، جن کی فہرست خاصی طویل ہے، ایرانی صرف امیر خسرو، ہی کے نام سے واقف ہیں۔ کچھ لوگوں نے بیدل کا نام بھی لیا، لیکن بے دلی سے۔ اس بے خبری یا بے التفاتی کی تاویل صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ہندستانی فارسی کا سارا سرمایہ قدیم فارسی

یں ہے، اور ہندستان میں آج بھی بڑی حد تک قدیم فارسی ہی مقبول ہے۔ اس کے برعکس ایران میں جدید فارسی کا سکہ رائج ہے۔ عام طور پر لوگ قدیم فارسی سے واقف بھی نہیں ہیں اور قدیم و جدید فارسی میں وہی بعد پیدا ہو گیا ہے جو دکھنی اور جدید اردو میں ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی فارسی شاعری کی زبان بھی قدیم ہی ہے، اس لیے ایرانیوں کو اس سے بھی کوئی لگاؤ پیدا نہ ہو سکا۔ آقائے محیط طباطبائی ہی تہران میں ایک ایسے بزرگ ملے جنھیں "دکتر اقبال شاعر و فیلسوف معروف ہندستان" کی شاعری سے دلچسپی ہی نہیں، عشق تھا۔ اقبال سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی، جس کا انھیں شدید صدمہ تھا۔ "محیط" ہی کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی وہ نکالتے تھے۔ اس کا ایک اقبال نمبر بھی انھوں نے شایع کیا تھا۔ اسی نمبر سے مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے یہ کوشش بھی کی تھی کہ تہران کے کسی خیاباں کا نام بھی اقبال کے نام پر رکھا جائے[1]۔

منیرہ کو فارسی شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ اقبال کا فارسی کلام میں نے ان کو دیا، تو بعض نظموں کی تعریف تو انھوں نے ضرور کی، لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے، انھوں نے کہا:

"این مال مانیست مال افغانیان است"

---

[1] قیام پاکستان کے بعد عموماً اور ایران و پاکستان کی دوستی کے بعد یہ صورت حال بدل گئی ہے، اور اب ڈاکٹر اقبال "شاعر پاکستان" کی حیثیت سے ایران میں جانے جاتے ہیں، اور ان کے نام سے ایک شاہراہ بھی موسوم کی گئی ہے۔

یعنی اقبال کی فارسی ایرانی نہیں، افغانی ہے۔ اور یہ ہے بھی حقیقت — اقبال ہی پر منحصر نہیں ہے، ہندستانی فارسی ہر دور میں افغانستان سے قریب تر رہی ہے۔

جدید فارسی میں المانی، فرانسیسی اور انگریزی الفاظ، خصوصاً فنی الفاظ اور اصطلاحیں، بے پناہ داخل ہوگئی ہیں۔ ان میں سے اکثر کی ہیئت ایران کی صوتی خصوصیات نے بدل ڈالی ہے۔ عربی الفاظ کو ترک کرنے کی روش نے بھی جدید فارسی کو قدیم فارسی سے الگ کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس کی بہت اچھی مثال لفظ 'عادل' ہے۔ ایک ایرانی دوست سے میں نے "نوشیروان عادل" کا ذکر کیا:

"ایں آغا کہ بودند؟" ناک بھوں چڑھا کر انھوں نے سوال کیا۔

جب میں نے مزید تشریح کی تو بڑے معصومانہ انداز میں اس دوست نے بتلایا کہ جس کا ذکر میں نے کیا ہے اسے ایران میں "نوشیروان دادگر" کہتے ہیں۔ ان ہی نے مجھے بتایا کہ تہران میں ایک اسکول بھی "نوشیروان دادگر" کے نام سے ہے، جسے ہندستانی پارسی چلاتے ہیں۔

عربی کے بعض الفاظ جو فارسی میں باقی بھی ہیں، وہ اردو سے بالکل مختلف معنوں میں مستعمل ہیں۔ ایک ایرانی کتب فروش نے، جس سے میری خاصی واقفیت ہوگئی تھی ایک مرتبہ مجھ سے پوچھا میں کیا کام کرتا ہوں۔ میں نے جواب دیا "صحافی ہستم"۔ یہ سن کر اس نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا۔ جب میں نے اس کی حیرت کی وجہ پوچھی تو اس نے بتلایا کہ 'صحافی' تو جلد ساز کو کہتے ہیں۔

زبان و بیان کے اختلاف سے قطع نظر ہندستان و ایران کے

کلچر میں بھی بڑی مماثلت ہے۔ مثلاً ایرانیوں کا تکلف، جسے اپنی بولی میں وہ 'تعارف' کہتے ہیں، اس گزشتہ لکھنؤ کی یاد دلاتا ہے، جو اب بڑی تیزی سے معدوم ہو رہا ہے۔

کسی ایرانی گھر میں آپ جائیں تو صاحب خانہ، خواہ عمر میں آپ سے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، کبھی بھی آپ کے آگے نہ چلے گا۔ "پس شما" یا "شما مہمان عزیز ہستی" کہہ کر آپ کے پیچھے ہی چلنے پر اصرار کرے گا۔ آپ اس سے لاکھ کہیے لیکن وہ آپ کی ایک نہ سنے گا، اور "شما تعارف شاہ عبد العظیمی می کنی" کہہ کر آپ کو آگے چلنے پر مجبور کر دے گا۔

یہی حال ان کی مہمان نوازی کا بھی ہے۔ ایرانی چائے کے بڑے لتی ہوتے ہیں۔ جنگ کے دنوں میں زندگی کی اور ضروریات کی طرح چائے بھی عنقا تھی۔ شکر کا بھی یہی حال تھا ـــــ فوجی باورچی خانوں کی استعمال شدہ سکھائی ہوئی چائے ایرانی چائے خانوں میں اور متوسط طبقے کے گھرانوں میں عام طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ امریکی، انگریزی اور ہندستانی کینٹینوں کے منیجروں کی وساطت سے اور چیزوں کی طرح چائے اور شکر بھی تھوڑی بہت بازار میں آجاتی تھی، جس کے منہ مانگے دام ملتے تھے۔ معمولی قسم کی چائے جو کینٹین میں تین چار روپے پونڈ ملتی تھی، بازار میں وہ پچیس تیس روپے پونڈ سے کم میں نہیں ملتی تھی۔ نچلے اور نچلے متوسط طبقے کے ایرانی بلا شکر کی چائے پیتے تھے۔ کچھ لوگ قند کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی اپنے پاس رکھتے تھے اور چائے

پینے کے بعد منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اس ٹکڑے کو زبان پر رگڑ لیا کرتے تھے۔

لیکن نچلے طبقے کے کسی ایرانی کے گھر بھی ہم جاتے تو ہمارا استقبال کرنے کے ساتھ ہی صاحب خانہ "خونم (خانم) چائے بیار" کا نعرہ لگاتا۔ اور جب خانم چائے لے آتیں تو ہمارے انکار کے باوجود، صاحب خانہ اصرار کر کے ہمارے فنجان میں اتنی ہی شکر ڈالتا، جتنی ڈالنی چاہیے۔ کسی ایرانی کو اگر ہم ایک پاؤنڈ چائے یا شکر تحفتہً دے دیتے تو اس کی احسان مندی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ اگر چند گز پاپلین یا پلنگ کی ایک چادر ہم پیش کر دیتے تو وہ بے دام کا غلام بن جاتا۔

کچھ ترکاریاں اور پھل بھی ہندستان و ایران میں مشترک ہیں۔ اس سلسلے میں بیگن، کھیرے اور بھٹے کا خصوصیت سے نام لیا جا سکتا ہے۔ بیگن کی ہندستان میں جتنی بے قدری ہے، ایران میں اتنی ہی اس کی قدر ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ 'بادنجان' (بیگن) پر ایرانی جان دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں یقیناً حیرت ہوئی کہ اکثر پلاؤ میں بھی مسلّم بیگن نکل آتا ہے۔

کھیرے کی توقیر بھی بیگن سے کم نہیں ہے۔ بڑی بڑی پارٹیوں میں بھی اعلا قسم کے پھلوں کے ساتھ کھیرا بھی رکھا جاتا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہاں کے کھیرے ہمارے یہاں کے کھیروں سے زیادہ شاداب اور خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔

بھٹے کا حال بھی بیگن اور کھیرے سے مختلف نہیں ہے۔ بھٹے

کی فصل میں تہران کی سڑکوں پر جگہ جگہ بھنے ہوئے بھٹے ہندستان ہی کی طرح بیچے اور کھائے جاتے ہیں۔

ہندستان کے علم 'قسمت شناسی' سے بھی ایرانیوں کو حد درجہ خوش اعتقادی ہے۔ ان کا شاید خیال ہے کہ ہر ہندستانی پیدائشی جوتشی ہوتا ہے۔ اچھی اور ستھری پارٹیوں میں بھی اکثر ایرانی عورتیں، اور کبھی کبھی مرد بھی، کسی ہندستانی کو گھیر لیتے اور بڑی عقیدت مندی کے ساتھ اپنا ہاتھ اسے دکھاتے۔ ایک دوست نے بتایا کہ ایران آنے کے بعد بعض ہندستانیوں نے انگریزی کتابوں کی مدد سے اس فن شریف میں دست رس حاصل کی، کیوں کہ ایرانی "مہرخوں" سے ملاقات کے لیے اس سے بہتر اور کوئی "تقریب" نہیں ہو سکتی تھی۔

علم قسمت شناسی سے ایرانیوں کو صرف گہری دل چسپی ہی نہیں ہے، بلکہ بعض اعتبار سے اس علم میں وہ ہندستانیوں سے بھی آگے ہیں۔ اور ان کے عجیب و غریب طریقے ہیں۔ مثلاً آپ کے قہوہ پی لینے کے بعد آپ کی خالی پیالی طشتری پر الٹ دی جاتی ہے۔ ڈیڑھ دو منٹ میں تلچھٹ بہہ کر پیالی کی دیوار پر آڑی ترچھی لکیریں بنا دیتی ہے۔ ان ہی آڑے ترچھے خطوط کو دیکھ کر قہوہ پینے والے کی قسمت کا حال بتایا جاتا ہے۔

اس فن سے میرے بزرگ کرم فرما آقائے جعفر زادہ کو اور ان کی بیٹی منیژہ کو بھی خاصی دل چسپی تھی، بلکہ ملکہ حاصل تھا۔ ان کے بیٹے عباس باپ اور بہن دونوں کا خوب مذاق اڑاتے، لیکن

اس سے ان دونوں کے اعتقاد میں کوئی فرق پیدا نہ ہوتا۔

ایک اتوار کو دن کا کھانا میں نے آقائے جعفر زادہ کے یہاں کھایا۔ کھانے کے بعد قہوہ آیا۔ جب میں پی چکا تو منیزہ نے باپ کے اشارے پر، میری پیالی کو تختۂ مشق بنایا۔ اس کوشش میں آقائے جعفر زادہ نے بھی ان کی مدد کی۔ پیالی کی آڑی ترچھی لکیروں کو غور سے دیر تک دیکھنے کے بعد دونوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ میں جلد ہی ایران سے جانے والا ہوں۔ اور پورب نہیں، پچھم کی طرف جاؤں گا۔ میں اور عباس ان دونوں کا مذاق اڑاتے رہے، لیکن انھیں اپنے فیصلے کے اٹل ہونے کا قطعی یقین تھا۔

"فی الحال اس پیشین گوئی کے پورے ہونے کا مجھے کوئی امکان نظر نہیں آتا۔"

میرے اس جواب کے بعد آقائے جعفر زادہ اور منیزہ نے زبردستی مجھے دوسری پیالی پلائی اور پھر سابقہ عمل کو دہرایا۔

"میں شرط لگاتا ہوں" آقائے جعفر زادہ نے قطعیت کے ساتھ کہا "ہماری پیشین گوئی سو فی صدی صحیح ہوگی۔"

"تو ہمارے ہندستانی دوست کی رخصتی دعوت جلد ہونی چاہیے" عباس نے باپ کے فیصلے کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا "اور یہ بھی طے ہو جائے کہ دعوت میں کیا کیا ہوگا۔"

اس قصے کے تیسرے ہی دن اپنی میز پر بیٹھا میں کچھ لکھ رہا تھا اور راشد بغداد سے آئی ہوئی ڈاک دیکھ رہے تھے۔

"حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد" راشد نے ایک کاغذ میری

طرف بڑھاتے ہوئے کہا "جاؤ قاہرہ کی بھی سیر کر لو۔"

اس کاغذ کو، جس میں صرف چند سطریں تھیں، میں نے کئی بار پڑھا، جیسے اپنی آنکھوں پر مجھے اعتبار نہ آ رہا ہو۔ آقائے جعفر زادہ اور منیژہ کی تصویریں میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہی تھیں اور ان کی پیشین گوئی بار بار یاد آ رہی تھی، جو دو ہی دن پہلے انھوں نے کی تھی۔ اس کاغذ کے مطابق مجھے جلد سے جلد ہوائی جہاز سے قاہرہ جانا تھا۔

"کب جا سکو گے؟" راشد نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔

"جتنی جلد سیٹ بک ہو سکے۔"

بغداد چھوڑنے کا مجھے افسوس نہیں ہوا تھا، لیکن تہران چھوڑنے کا یقیناً دکھ ہوا۔ اور اسباب سے قطع نظر، اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ نسلی، لسانی و ثقافتی اعتبار سے عراقیوں کے مقابلے میں ایرانی ہندستانیوں سے قریب تر ہیں۔ پھر عربی سے نابلد ہونے کی وجہ سے بغداد کی شہری زندگی سے بڑی حد تک بے گانہ ہی رہا تھا۔ تہران کا تجربہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ کتابی فارسی تھوڑی بہت آتی تھی، اس لیے بول چال کی مشق بہم پہنچانے میں زیادہ دقت نہ لگا۔ چناں چہ ایران میں "غریب شہر" ہونے کا وہ احساس نہ ہونے کے برابر تھا، جو بغداد میں بڑی شدت سے محسوس ہوا تھا۔

کیپٹن مریم

تہران کی بہت سی یادوں کو سینے سے لگائے، وسط اکتوبر ۱۹۴۵ء کی ایک صبح کو، قاہرہ کے لیے روانہ ہوا، جہاں ایک ہفتہ وار اخبار کی ترتیب و طباعت کی ذمے داریاں میری راہ تک رہی تھیں۔ دن کے دس بجے ہمارے جہاز نے پرواز شروع کی اور بغداد و بیروت میں گھنٹہ گھنٹہ بھر دم لیتا ہوا سرِشام المانہ کے ہوائی اڈے پر جا اترا۔ یہی اس کی بھی آخری منزل تھی۔

قاہرہ کی 'جگمگاتی جاگتی' سڑکوں سے جب ہم گزرے تو دو جگہوں نے خصوصیت سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ بی، او، اے، سی کی کوچ (بس) جو ہمیں شہر لے جا رہی تھی، ایک چھ منزلہ عمارت کے سامنے رکی۔ اس کے ساتھ کنڈکٹر نے اعلان کیا:

"شپرڈس جانے والے مسافر مہربانی فرما کر اتریں"

"شپرڈس یہی ہے؟" اپنے ہم سفر یہودی کیپٹن سے میں نے پوچھا، جو تہران سے میرے ساتھ آ رہا تھا، اور ہوائی جہاز میں

بھی میری بغل ہی میں بیٹھا تھا۔
"ہاں! قاہرہ کی سماجی زندگی کا اہم ترین مرکز اور قاہرہ سے گزرنے والے مسافروں کا رین بسیرا 'شپرڈ' بھی ہے۔ یہ بڑی تاریخی عمارت ہے۔ اس کی نچلی منزل کے اندرونی حصے میں ایک بڑا سا چوکور پتھر بھی نظر آئے گا' جس میں موٹے موٹے حرفوں میں کندہ ہے: 'جب نپولین مصر آیا' تو اسی جگہ اس کا ہیڈکوارٹر تھا' بین الاقوامی سیاسی شخصیتوں سے لے کر بین الاقوامی عیّار تک اس جگہ جمع ہوتے ہیں۔"
شپرڈس سے روانہ ہونے کے پانچ ہی منٹ بعد ہماری گاڑی پھر ایک اور چار منزلہ عمارت کے سامنے رکی۔ کنڈکٹر نے اعلان کیا:
"وائی، ڈبلو، سی، اے، جانے والے مسافر اتریں۔"
یہ سنتے ہی دو نوجوان برطانوی باوردی خواتین اپنا سامان سمیٹتی ہوئی کھڑی ہوئیں' جو بیروت سے ہماری ہم سفر ہوگئی تھیں اور جنھیں اب تک للچائی ہوئی نظروں سے ہم تکتے رہے تھے۔ وائی، ڈبلو، سی، اے کی یہ عمارت ایک بڑے سے چوراہے پر تھی' جس کے وسط میں کسی مصری کا ایک دیو قامت مجسمہ اور اس کے مقابل کتابوں کی ایک بڑی سی دکان تھی۔
قاہرہ پہنچنے کے دوسرے ہی دن سہ پہر کو اپنے کام کی ذمے داریاں سنبھالنے کے بعد پریس کی طرف چلا' جہاں ہمارا ہفتہ وار اخبار 'ہندستان' عربی ٹائپ میں چھپتا تھا' تو ہماری جیپ وائی، ڈبلو، سی، اے کی طرف سے پھر گزری۔

"آیئے ایک پیالی کافی پی لیں" جیپ روک کر لفٹننٹ رفیق نے دعوت دی جو پریس والوں سے تعارف کرانے کے لیے میرے ساتھ جا رہے تھے "پریس جاتے ہوئے، اور اکثر واپسی میں بھی، اس جگہ دم لے لیتا ہوں۔ یہاں کی کینٹین میں کافی بھی اچھی ملتی ہے۔

"اچھا کیا آپ نے بتا دیا" میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "اور اس جگہ کو دریافت کرنے کی زحمت سے بچا لیا۔"

"اس جگہ کا نام میدان کامل پاشا ہے" میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے انھوں نے ایک طرف اشارہ کیا "اور یہ کامل پاشا کا مجسمہ ہے۔ اس کے بالکل سامنے کتابوں کی ایک دوکان ہے، جہاں عربی کی بہت کم، لیکن انگریزی، فرانسیسی اور دوسری یوروپین زبانوں کی کتابیں اور رسالے بڑی کثرت سے مل جاتے ہیں۔ فوجیوں کے مذاق کی سستی کتابیں بھی ملتی ہیں۔ لیکن حقیقتاً یہ کمیونسٹ لٹریچر کی منڈی ہے۔ اسی سے کوئی مصری کھلے بندوں اس میں گھسنے کی ہمت نہیں کرتا۔ بس اتحادی ملکوں کے فوجی ہی چھائے بچھائے رہتے ہیں۔"

"آپ بھی اس دوکان میں جاتے ہیں کبھی؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں کبھی کبھی چلا جاتا ہوں۔"

"تو آپ کو بھی شاید کمیونزم سے کچھ دلچسپی ہے۔"

"کمیونزم سے تو نہیں، لیکن کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے ضرور

تھوڑی سی دل چسپی ہے۔"

"یہ بڑی دل چسپ بات ہے" میں نے کہا "ہمارے یہاں عورتوں کی ایک کہاوت ہے "گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز"۔ آپ کا بھی یہی حال معلوم ہوتا ہے۔ کیمونسٹ پارٹی سے آپ کی دل چسپی کی نوعیت کیا ہے؟"

"کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ساتھ میری دل چسپی کی وہی نوعیت ہے، جو روس کے ساتھ برطانیہ اور امریکہ کی دل چسپی کی ہے" اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا "کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا ہمارے مطالبۂ پاکستان کی حمایت کرتی ہے، اس لیے مجھے بھی اس سے دل چسپی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا معاملہ آپ کے برعکس ہے" میں نے جواب دیا "مجھے کیمونزم سے خاصی دل چسپی ہے۔ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کا ممبر تو نہیں، لیکن اس سے بہت قریب رہا ہوں، مگر اس سے مجھے اسی بنا پر اختلاف ہے کہ مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کی اور مطالبۂ پاکستان کی وہ حمایت کرتی ہے۔"

وائی، ڈبلو، سی، اے سے مجھے زیادہ دل چسپی نہ پیدا ہو سکی، لیکن پریس یا شہر آتے جاتے جب بھی میدان کامل پاشا سے گزرتا، کتابوں کی اس دوکان میں ضرور جھانک لیتا اور میری دل چسپی کی کوئی نہ کوئی چیز مل بھی جاتی۔

ترقی پسند ادبیات کی اس کھان میں اور کامل پاشا کے مجسمے

میں بڑا قریبی تعلق مجھے محسوس ہوتا۔ کامل پاشا پہلے مصری، بلکہ پہلے مشرقی تھے، جنھوں نے یہ ترقی پسندانہ نظریہ پیش کیا تھا کہ مذہب اور قومیت دو جداگانہ چیزیں ہیں، جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور یہ کہ مصر کے قبطی، عیسائی اور مسلمان ایک قوم ہیں۔ انھوں نے اس نظریے کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ ان کے بعد مصر متعدد انقلابات سے دوچار ہوا، لیکن ان کے بتائے ہوئے نظریے سے وہ انحراف نہ کر سکا۔

آگے چل کر کتابوں کی اسی دوکان کی وساطت سے دو چار مصری کمیونسٹوں اور کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری ہنری کوریل سے بھی میری ملاقات ہوئی اور ان ترقی پسند ادیبوں کے ایک جلسے میں شریک ہونے کا بھی موقع ملا، جن کا تعلق مصر کے اس کمیونسٹ گروپ سے تھا، جسے 'الفجر الجدید' (صبح نو) کہا جاتا تھا۔ اسی نام کا ایک رسالہ بھی اسی گروپ کا ترجمان تھا۔

ایک کمیونسٹ دوست نے مجھے بتایا کہ کتابوں کی یہ دوکان ہنری کوریل کی نجی ملکیت ہے۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد جولائی ۱۹۴۶ء میں صدقی پاشا کی حکومت نے قاہرہ، اسکندریہ اور دوسرے مقامات کے کمیونسٹوں کے ساتھ کوریل کو بھی گرفتار کیا تو قاہرہ کے انگریزی روزنامہ 'ایجپشین گزٹ' سے میری معلومات میں اتنا اضافہ ہوا کہ کوریل یونانی النسل مصری لکھ پتی ہے۔

قاہرہ اور دوسرے شہروں میں بھی لاتعداد فرانسیسی، اطالوی اور یونانی خاندان پشتوں سے آباد ہیں اور انھوں نے مصری شہریت

اختیار کرلی ہے۔ ان ہی میں کوریل کا خاندان بھی ہے۔ کوریل کے گھر جانے کا بھی مجھے اتفاق ہوا تھا جو کسی لکھ پتی کا تو نہیں، لیکن کھاتے پیتے متمول مصری کا ضرور معلوم ہوتا تھا۔

کتابوں کی اسی دوکان کے صدر دروازے سے متصل ایک لمبی سی میز پر 'نوآمد' کتابیں سلیقے سے چنی رہتی تھیں۔ قاہرہ پہنچنے کے چار ہفتے بعد، وسط نومبر ۱۹۴۵ء کی ایک شام کو نوآمد کتابوں کا میں جائزہ لے رہا تھا کہ میز کے دوسرے سرے پر ایک خاتون کھڑی نظر آئیں۔ چوبیس پچیس برس کا سن، پیارا پیارا نکھرا، رنگ اور چہرے کی بناوٹ یورپین، سر سے پاؤں تک نور کے سانچے میں ڈھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ خاتون کے جسم پر بھی خاکی وردی تھی۔ ان کے کاندھے پر دونوں طرف تین تین سنہرے جگمگاتے ستارے ان کے کیپٹن ہونے کی نشان دہی کر رہے تھے۔

صورت آشنا ہی نہیں، ہم ایک دوسرے سے کچھ واقف بھی تھے۔ سر کے اشارے سے ایک دوسرے کو ہم نے سلام کیا۔ آج سے پہلے بھی کئی بار اسی دوکان میں وہ نظر آئی تھیں اور ان سے سرسری بات چیت بھی ہوئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں آج ان میں غیر معمولی کشش مجھے محسوس ہوئی۔

میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا تھا۔ ایک کتاب تو میرے سامنے ضرور تھی، مگر سارا دھیان ان ہی خاتون میں لگا تھا۔ پانچ سات منٹ میں بڑھتے بڑھتے وہ میرے قریب آگئیں ——— اس قدر قریب کہ ان کے جسم کی بھینی بھینی خوشبو، جسے لونڈر، کریم اور پاؤڈر

کی آمیزش نے کاک ٹیل بنا دیا تھا، میرے دل ودماغ ہی میں نہیں، روئیں روئیں میں بسی جا رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن جو پہلے ہی تیز ہو چکی تھی تیز تر ہو گئی۔ پھر وہ گھوم کر اس الماری کے سامنے کھڑی ہو گئیں جو میری پشت پر تھی۔ اب ہماری پیٹھ ایک دوسرے کے مقابل تھی۔ چند منٹ کے بعد میں اضطراری طور پر گھوما تو میری نظر اس کتاب پر پڑی جو خاتون کے ہاتھ میں تھی۔

"کیپٹن" میں نے حواس مجتمع کر کے کہا "بیورلی نکلس کی 'ورڈکٹ آن انڈیا' جھوٹ کی پوٹ ہے۔ اس پر آپ اپنا وقت ضایع نہ کریں۔"

"اس کا ریویو میں نے پڑھا ہے" خاتون نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "ریویو لکھنے والے کا بھی یہی خیال ہے اور اس کتاب پر اپنی گاڑھی کمائی کے پیسے ضایع کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

اسی کتاب پر باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں، خاتون ہی کی تجویز پر، دوکان کے ایک گوشے میں منتقل ہو گئے جہاں نسبتاً پرانے اخبارات ورسایل بے ترتیبی سے ڈھیر تھے۔ اسی ڈھیر کو کریدتے ہوئے ہم دونوں ہندستان کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

"ہندستان میں برطانوی سامراج کے رول کو اور ہندستان کے موجودہ سیاسی حالات کو سمجھنے میں کون سی کتابیں مفید ہو سکتی ہیں؟" خاتون نے سوال کیا۔

"رجنی پامے دت کی 'انڈیا ٹوڈے' پڑھیے۔"

"آر، پی، ڈی کی کتاب کے تو دونوں اڈیشن میرے پاس ہیں"
خاتون نے فخریہ لہجے میں جواب دیا "بلکہ اسی کتاب سے مجھے
ہندستان سے دل چسپی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ہی 'مارکس
آن انڈیا' میں نے پڑھی۔

خاتون باتیں تو مجھ سے کر رہی تھیں، لیکن ان کی نظریں اس طرح
چاروں طرف گھوم رہی تھیں، جیسے کسی کو ڈھونڈھ رہی ہوں۔ ان
کی یہ ادا مجھے بے حد اکھر رہی تھی۔ میں ابھی اس پر غور ہی کر رہا
تھا کہ انھوں نے کچھ جزبز ہو کر کہا:

"یہ جگہ تو اور بھی بری ہے۔ سب کی نظریں ہمیں پر گڑی
ہیں۔"

"آیئے وائی، ڈبلو، سی، اے چلیں۔"

"وہ تو اور بھی خطرناک جگہ ہے" میری تجویز مسترد کرتے
ہوئے انھوں نے حکم دیا "آیئے میرے پیچھے پیچھے۔"

اور کڑی کمان کے تیر کی طرح وہ دوکان سے نکلیں۔ میں بھی ان کی
ہدایت کے مطابق پیچھے پیچھے ہولیا۔ اب ہم دونوں اس سڑک پر تھے
جو کامل پاشا کے مجسمے کے بالکل سامنے تھی اور وہ ہماری پشت پر
اس طرح ہاتھ پھیلائے تھا جیسے ہمیں روک کر کہنا چاہتا ہو:

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ عشق و مستی کو
مزاجِ سطحِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی!

راستے میں ہم کوئی بات چیت نہ کر سکے۔ خاتون کبھی مجھ سے
آگے نکل جاتیں اور کبھی پیچھے رہ جاتیں۔ جس سڑک پر ہم چل رہے

تھے۔ وہ آگے چل کر قاہرہ کے مشہور ہوٹل کانٹی نینٹل کی طرف مڑتی تھی۔ میرا گمان تھا کہ خاتون وہیں جا رہی ہیں۔ میں یہ سوچ کر جی ہی جی میں خوش ہو رہا تھا کہ وہاں اطمینان سے باتیں ہو سکیں گی کہ خاتون یکایک ایک دیسی قہوہ خانے میں گھس گئیں، جہاں فوجیوں کے جانے کی ممانعت تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں ٹھٹک کر کھڑا ہوا، اور میری آنکھوں کے سامنے حسن کی ناز آفرینیوں اور عشق کی دراز دستیوں سے لے کر کورٹ مارشل تک کے سب ہی نقشے بھر گئے۔ لیکن مجھے فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔ اور ہر چہ بادا باد کہتا ہوا میں بھی قہوہ خانے میں گھس گیا۔

"کیپٹن" سامنے ٹنگے ہوئے بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا "یہ جگہ میرے اور آپ کے لیے آؤٹ آف باؤنڈس ہے۔"

"میں بھی جانتی ہوں" خاتون نے ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ کا جو حشر ہوگا، میرا اس سے کہیں زیادہ خراب ہوگا" پھر رک کر انھوں نے کہا "آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ یہ کس قسم کی عورت ہے۔ بات یہ ہے کہ میں ایک ایسے دیس کی رہنے والی ہوں....."

"بس بس رہنے دیجیے" ان کی بات کاٹتے ہوئے میں نے کہا "آپ کے کاندھوں پر ستاروں کے نیچے جو سرخ پٹی ہے اسے دیکھ کر پہلے ہی دن میں سمجھ گیا تھا کہ آپ کہاں کی رہنے والی ہیں، لیکن نہ جانے کیوں آج یہ بات میرے

ذہن سے بالکل نکل گئی۔"

"آپ کو میرے وطن سے اس درجہ نفرت ہے کہ اس کا نام لینا یا سننا بھی آپ کو گوارا نہیں" خاتون نے بڑے پرجوش لہجے میں کہا "آپ اسے پسند کریں یا نہ کریں میں دکھنی افریقہ کی رہنے والی ہوں۔ اپنے وطن سے اور اپنے وطن کے رہنے والوں سے، خواہ وہ گورے ہوں یا کالے، مجھے شدید محبت ہے۔ لیکن وہاں کے موجودہ حکم رانوں سے مجھے اسی درجہ نفرت بھی ہے۔ میں ان کی دشمن ہوں اور ان کی حکومت کا تختہ اُلٹ دینا چاہتی ہوں۔"

"آپ بہت جذباتی معلوم ہوتی ہیں" میں نے خاتون کا جوش ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی "اور جذباتی انسان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں آپ کی ہر بات کو سچ سمجھتا ہوں۔"

"شکریہ" خاتون نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "میں یقیناً جذباتی ہوں۔ جذباتی انسان کی آپ نے جو تعریف کی ہے، اس میں اتنا اور اضافہ کیجیے کہ وہ محبت اور نفرت دونوں تن من سے کرتا ہے۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اپنے ملک کی حکومت سے مجھے جتنی نفرت ہے، اسی قدر اپنے وطن کے بسنے والوں سے پیار ہے۔ دکنی افریقہ میں جو ہندستانی بستے ہیں ان سے بھی مجھے اتنی ہی محبت ہے، جتنی وہاں کے سفید فام باشندوں سے ہے۔ یوسف داؤد اور ڈاکٹر نائکر کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ یہ دونوں میرے ہندستانی النسل

دوست ہیں، ساتھی ہیں، کامریڈ ہیں۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں۔ اور اگر تم کو غلط فہمی نہ ہو تو میں کہوں گی کہ نہ جانے کیوں تم کو بھی میں پسند کرتی ہوں اور تم سے بھی دوستی کرنا چاہتی ہوں"۔

"ہم ہندستانی اواگون کے قایل ہوتے ہیں" میں نے کہا "میرا گمان ہے کہ پچھلے جنم میں دکنی افریقہ کے کسی ہندستانی گھر میں تم نے جنم لیا ہوگا۔ اور شاید اسی لیے میں اتنی ہی دیر میں...."

"دیکھو دیکھو!" میری بات کاٹتے ہوئے خاتون نے کہا "رومانٹک بننے کی کوشش نہ کرنا۔ میں ایسے نوجوانوں کو پسند نہیں کرتی جو اتنی جلد دل دے بیٹھتے ہیں"۔

"مادموزیل! آپ جلد باز بھی بہت معلوم ہوتی ہیں" میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا "میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ اتنی ہی دیر میں آپ کو میں سمجھ گیا ہوں"۔

"جھوٹ، بالکل جھوٹ" خاتون نے پسپائی کے لہجے میں کہا "میری جلد بازی سے فائدہ اٹھا کر بات تم نے بدل دی۔ میں تمھیں ایسا بے حس نہیں مان سکتی، جیسا کہ تم اپنے کو ظاہر کر رہے ہو"۔

"خاتون" گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے کہا "آپ تو شاید باضابطہ کمیونسٹ ہیں"۔

"ہاں ہوں تو"۔

"لیکن میں حیران ہوں" میں نے کہا "آپ نے اپنے حسن کو برقرار کیسے رکھا؟"

"کیا مطلب؟" خاتون نے احتجاجی لہجے میں کہا "کیا کمیونسٹ اپنی صورت بگاڑ لیا کرتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے" ان کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے کہا "کمیونسٹ مردوں سے زیادہ کمیونسٹ عورتیں ڈائی لکٹی کل میٹریا لزم اپنے اوپر طاری کرلیتی ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نسائیت کے ساتھ ساتھ ان کا حسن بھی خاک میں مل جاتا ہے۔ لیکن آپ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس معلوم ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ قدرت نے آپ کو حسن کی دولت اس فیاضی سے عطا کی ہو ——"

"نان سنس" خاتون نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "اچھے کمیونسٹ سے زیادہ تم من چلے نوجوان معلوم ہوتے ہو"

"من چلا نوجوان ہی اچھا کمیونسٹ بھی ہوسکتا ہے"

"اگر من چلے پن کو کمیونزم پر غالب نہ آنے دے"

"تم جتنی حسین ہو" اپنے ترکش کا ایک اور تیر میں نے سر کیا "اتنی ہی ذہین بھی معلوم ہوتی ہو"

"اور تم بھی کچھ کم نہیں ہو" پھر خاتون نے کچھ رک کر کہا "ہم ابھی ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکے ہیں، تاہم ——"

"خاتون" میں نے احتجاجی لہجے میں کہا "اپنی ذہانت پر تو تم شک کرسکتی ہو، لیکن میری ذہانت پر شبہ کرنے کا تمھیں

حق نہیں ہے۔"
"پوری بات تو سنی نہیں اور لگے احتجاج کرنے" خاتون نے جھنجھلا کر کہا "میں تو یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ایک دوسرے کو اچھی طرح نہ سمجھ سکنے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئے ہیں۔"
"تمھارا خیال اگر صحیح ہے" سنجیدگی طاری کرتے ہوئے میں نے کہا "تو یہ ہے بڑی پریشان کن صورتِ حال"۔
"اور خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔"
"آپ کے لیے یا میرے لیے؟"
"دونوں کے لیے" خاتون نے بھی سنجیدگی کے ساتھ اضافہ کیا "مگر ایک بات یاد رکھنا کہ لینن کی طرح عورت کو میں بھی پانی کا گلاس نہیں سمجھتی۔"
"لینن کی یہ بات مجھے بھی یاد ہے جو اس نے تایازٹکن سے کہی تھی" گفتگو کے دھارے کا رخ پھر رومانیت کی طرف موڑتے ہوئے میں نے کہا "لیکن آج تمھیں اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہوں کہ لینن جیسے خوش مذاق انسان نے ایسی بھونڈی تشبیہ کیوں دی؟"
"اس میں بھونڈا پن کیا ہے؟"
"کم از کم تم کو تو پانی کے گلاس سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ کچھ فلسفیانہ کچھ عاشقانہ لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر میں نے کہا "تم کو تو شراب کے گلاس سے

تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کے پینے سے کہیں زیادہ اس کے دیکھنے میں نشہ ہے"۔

"شکریہ" خاتون نے، جن کا چہرہ میری بات سن کر گلاب بن چکا تھا، طنز اور پسندیدگی کے لہجے میں کہا "ذہانت اگر زیادہ بڑھ جائے تو اس کے ڈانڈے حماقت سے مل جاتے ہیں"۔

دکنی افریقی خاتون نے جس قہوہ خانے میں پناہ لی تھی، وہاں میرے لیے تو نہیں، لیکن خود ان کے لیے اس سے زیادہ دیر ٹھہرنا شاید ممکن نہ تھا۔ وہاں کی میز کرسیاں، پیالی پلیٹیں، بیروں کے کثیف کپڑے اور ان کے طور طریقے، اور سب سے بڑھ کر وہاں کا ماحول اور بیٹھنے والوں کا ہر ہر انداز پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ یہ قہوہ خانہ قاہرہ کے نچلے طبقے کے لوگوں کے غم غلط کرنے کا سہارا ہے۔ اسی طبقے کی دو چار عورتیں بھی، فلاحین کی وضع کے برقعے اوڑھے بیٹھی تھیں۔ شور و غل بھی بے حد تھا۔ ریڈیو اونچے سروں میں بج رہا تھا۔ گانے والی بھی ام کلثوم تھی، جس کی آواز مصریوں ہی کو نہیں، ساری عرب دنیا کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ اسی نے قہوہ خانے کے شور و غل میں جنوں کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قہوہ خانے کے بیرے کے سوا اور کسی نے ہماری طرف توجہ نہ کی۔

"کتنی پیاری ہے یہ آواز" ام کلثوم کی تانوں سے متاثر ہو کر خاتون نے متاسفانہ لہجے میں کہا "کاش میں عربی جانتی"۔

"گانے والی کی آواز تو یقیناً پیاری ہے۔ مگر ــــ"

"مگر کیا؟" خاتون نے کہا "تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ میری آواز اس سے بھی اچھی ہے۔ مبالغے کی بھی حد ہوتی چاہیے۔ تم نے تو ان شاعروں کو بھی مات کر دیا جنھیں افلاطون نے ناکارہ قرار دے کر اپنی جمہوریت میں جگہ دینا پسند نہیں کیا تھا۔"

"میری حسین خاتون" ان کے جواب سے لطف لیتے ہوئے میں نے کہا "میں تو آپ کو بتلانا چاہتا تھا کہ اس گانے والی کی آواز جتنی دل کش ہے، وہ اتنی ہی بدصورت ہے۔ مصر میں شاید ہی کوئی عورت بدصورتی میں اس گانے والی کا مقابلہ کر سکے۔"

"واقعی؟" خاتون نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

"شاید اسی سے اس کی آواز اتنی اچھی ہے۔"

"عربی تو میں نہیں جانتی، مگر عربی موسیقی میرے کانوں کو بہت اچھی لگتی ہے" پھر رازداری کے لہجے میں خاتون نے کہا "اس کی وجہ بتاؤں۔ میری رگوں میں بھی عرب خون ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"میرا خاندان اسپینی عرب ہے، جو کسی زمانے میں مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا۔ تم کو معلوم ہے عربی میں میری کو مریم کہتے ہیں۔ میرے گھر والے مجھے مریم ہی کہتے ہیں۔ مجھے بھی یہی اچھا لگتا ہے۔ تم بھی مریم ہی کہہ کر مجھے مخاطب کیا کرو۔ مگر ہاں کسی کے سامنے مریم نہ کہنا، کیپٹن میری ہی کہنا۔"

"یہ بڑا دلچسپ اتفاق ہے" میں نے کہا "مجھے بھی اپنے متعلق

کیپٹن مریم

یہی خوش فہمی ہے کہ میری رگوں میں بھی عرب خون گردش کر رہا ہے اور میرے خاندان کے لوگوں کو یقین ہے کہ ہم سب پیغمبر اسلام کے پہلے خلیفہ کی اولاد ہیں۔"

"شاید اسی وجہ سے ہم لوگ آج کی ملاقات سے پہلے ہی ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے" میرے لطیف طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے خاتون نے میری تائید کی "یقیناً یہ بڑا دلچسپ اتفاق ہے۔"

یہ تھی دکنی افریقی کیپٹن مریم کی اور میری پہلی تفصیلی ملاقات، جس میں ہار جیت برابر ہی کی رہی۔ اگلے سنیچر کو شام کے کھانے پر ملنے کا ہم نے پروگرام بنایا، مگر سوال یہ تھا کہ ہم ملیں کہاں۔ کسی ایسی جگہ کی ہمیں تلاش تھی جہاں نسل پرست اور ہندستان دشمن دکنی افریقی آنکھیں ہمیں دیکھ نہ سکیں۔

"ایک جگہ ہو سکتی ہے" بہت سی جگہوں کو مسترد کرنے کے بعد مریم ہی نے تجویز پیش کی "شیرڈس ہوٹل اور خالیس رستوران کی درمیانی سڑک پر جو کیبرے ہے، اسی کے بغل میں ایک چھوٹا سا بار ہے۔ بہت کم لوگ وہاں جاتے ہیں اور وہ آوٹ آف بانڈس بھی نہیں ہے۔ بار کا مالک میرا جاننے والا ہے۔ کھانے کا بھی وہ انتظام کر دے گا۔ جگہ بہت محفوظ ہے۔ ہم دکھنی افریقی کمیونسٹ جو گنتی میں چار ہی پانچ ہیں۔ کبھی کبھی وہیں مل بیٹھتے ہیں۔ میں وہاں شام کو ساڑھے سات بجے پہنچ جاؤں گی۔"

"میں بھی اسی وقت پہنچ جاؤں گا۔"

"اچھا اب چلنا چاہیے" مریم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "ہماری آج کی ملاقات اگرچہ مختصر ہی رہی مگر"
"مگر اس کے نتائج شاید بہت دوررس ہوں"۔
"نتائج جو بھی ہوں" مریم نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "زندگی کے کے بنجر میدان میں آج ہم نے دوستی اور محبت کے بیج بوئے ہیں"۔

اتوار کے دن مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے متعینہ بار میں داخل ہوا، تو وہاں سناٹا تھا۔ جائزہ لینے کے لیے چاروں طرف نظر دوڑائی تو جگہ غیر محفوظ سی معلوم ہوئی۔ ایک ہال سا تھا، جس میں بیس بائیس چوکور میزوں کے گرد چار چار کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک کونے میں بار کا منیجر میز لگائے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ صدر دروازے کے بالکل سامنے شاہ فاروق کی ایک بڑی سی تصویر لٹک رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک نوجوان مصری جوڑا، دنیا وما فیہا سے بے خبر، ایک دوسرے میں گم تھا۔ ان کی میز ایسے زاویے سے رکھی تھی کہ شاہ فاروق کی پر ہوس نظریں براہ راست نوجوان خاتون کے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ نظروں ہی نظروں میں شاہ فاروق اس کی نوخیز جوانی کو اپنے وجود میں ضم کر لینا چاہتے ہیں۔
"آپ کہاں بیٹھنا پسند کریں گے؟" منیجر نے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے سوال کیا، جو مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔
"کہیں بیٹھ جاؤں گا" بے دلی سے میں نے جواب دیا۔
"میرا خیال اگر غلط نہیں ہے" منیجر نے بڑے ادب کے ساتھ کہا" تو

آپ ہندستانی ہیں"۔

"ہاں، میں ہندستانی ہوں"۔

"کسی کا انتظار ہے آپ کو؟"

"ہاں"۔

"کیپٹن میری کا؟"

"ہاں" میں نے سوال کیا "مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"کل وہ خود آئی تھیں، اور آج کے پروگرام کی تفصیلات بتا گئی تھیں۔ گھنٹہ بھر ہوئے ان کا ٹیلیفون بھی آیا تھا۔ بس وہ آنے ہی والی ہوں گی"۔

"شکریہ" میں نے کہا "میں یہیں ان کا انتظار کروں گا"۔

"آپ لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام میں نے اوپر اپنے کمرے میں کیا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے منیجر نے دعوت دی "چلیے آپ اوپر ہی بیٹھیے"۔

یہ کمرہ نیچے والے ہال کے برابر ہی تھا، جسے بڑے بڑے پردے لٹکا کر کئی حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ منیجر نے روشنی کر کے سارے پردے ایک طرف سرکا دیے تو اندازہ ہوا کہ سونے کے علاوہ ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کا بھی اسی سے کام لیا جاتا ہے۔

ہال کے پہلے حصے میں قدیم وضع کا ایک بڑا سا صوفہ سٹ اسی سے ملتی جلتی چند کرسیاں اور ایک گول میز رکھی تھی۔ میں جس صوفے پر بیٹھا تھا اس کے مقابل آتش دان پر دو قلمی تصویریں اور دو یونانی طرز کے مجسمے رکھے تھے۔ اس سے کچھ ہٹ کر کارل مارکس کی بڑی سی تصویر دیوار پر آویزاں تھی۔ اس کے ایک پہلو میں لینن کی

اور دوسرے میں اسٹالین کی نسبتاً چھوٹی تصویریں لٹک رہی تھیں۔ ان تصویروں کے بالمقابل ایک بڑا سا گروپ فوٹو تھا' جس میں پریسیڈنٹ روزولٹ کے ساتھ ایک طرف اسٹالین اور دوسری طرف چرچل بیٹھے تھے۔ ان تصویروں کے نیچے ایک بڑے سے شلف پر مارکس، اینگلز، لینن اور اسٹالین کی تصانیف قرینے سے رکھی تھیں۔

کمرے اور اس کے ماحول کا میں جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک سوڈانی آب دار چھوٹے سے طشت میں بیر کی ٹھنڈی بوتل، جلبی شیشے کا ہشت پہل گلاس اور مصر کے دستور کے مطابق شغل کے لیے تلی ہوئی موم پھلی کی پلیٹ لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوا' اور ایک چھوٹی سی میز پر سامان چن دیا۔

"اَشکرک" عربی میں اس کا میں نے شکریہ ادا کیا۔

جواب میں اس نے تعظیماً سر جھکایا اور کمرے سے نکل گیا۔ میں پھر یونانی وضع کے ان مجسموں میں گم ہوگیا جو سامنے آتش دان پر رکھے تھے۔ کچھ دیر بعد کسی کے پیروں کی چاپ محسوس ہوئی۔ گھوم کر دیکھا تو کیپٹن مریم اپنی فتنہ سامانیوں کے ساتھ سامنے کھڑی تھیں۔

"بہت دیر کی مہرباں آتے آتے" ان کا استقبال کرتے ہوئے اس مصرعے کے معنی بھی ان کو سمجھائے۔

"لیکن اس تاخیر میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اور جان پر کھیل کر آئی ہوں"۔

"یہ کیوں ؟"

کیپٹن مریم

"میرے ساتھ تین روحیں اور ہیں۔"

"وہ کس خوشی میں ؟"

"سات بجے کیمپ سے نکلی" مریم نے اپنی داستان شروع کی "کچھ دور چلنے کے بعد دیکھتی کیا ہوں ملٹری پولیس کی گاڑی بھی ٹیکسی کے پیچھے آ رہی ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ میرا ہی پیچھا کر رہی ہے۔ وائی، ڈبلو، سی، اے پہنچ کر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور کینٹین میں چلی گئی۔ سامنے تین دکنی افریقی کامریڈ نظر آئے جو مجھ سے پہلے کیمپ سے نکل چکے تھے۔ میں سیدھی ان کی میز پر جا بیٹھی۔ پانچ منٹ کے بعد ملٹری پولس کے دو سارجنٹ بھی وہاں وارد ہوئے۔ ہال پر انھوں نے ایک نظر ڈالی، پھر کاؤنٹر کی طرف بڑھے اور ایک ایک پیالی کافی پی کر چلتے بنے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کی سانس لی، لیکن مجھے اس کا بھی احساس تھا کہ خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ ان تینوں دکنی افریقی فوجیوں کو بھی ساتھ لے کر نکلوں تو شبہ کی گنجایش نہ رہے گی۔"

"یہ خیال تو اچھا تھا، لیکن —"

"ہاں" میری بات کاٹتے ہوئے مریم نے کہا "مجھے بھی اس کا احساس تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ آج کی ملاقات کا لطف آدھا بھی نہ رہے گا؛ لیکن سوا اس کے مجھے اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ میں نے سوچا کہ ملاقات نہ ہونے سے یہی بہتر ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ بہت دیر سے تم لوگوں کو ڈھونڈھ رہی تھی،

چلو تم کو ایک ہندستانی کامریڈ سے ملواؤں۔ اتفاقاً ان کا بھی آج کوئی خاص پروگرام نہیں تھا، اور وہ لوگ بھی تیار ہو گئے۔"

"اور تم ان لوگوں کو لے کر یہاں آ گئیں۔ وہ لوگ ہیں کہاں؟"

"جتنی آسانی سے تم نے یہ کہہ دیا، اس آسانی سے یہاں تک نہیں پہنچی ہوں۔ وائی، ڈبلو، سی، اے سے نکلنے کے بعد ہماری ٹیکسی کچھ ہی آگے بڑھی تھی کہ سامنے سے پھر ملٹری پولس کی گاڑی آتی نظر آئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گھوم کر ہمارا پیچھا کرے، ہم ایک دوسرے راستے سے یہاں آ گئے۔ مگر خطرہ بالکل ٹلا نہیں ہے، کیوں کہ ہماری ملٹری پولس والوں کو معلوم ہے کہ ہم لوگ اس بار میں آتے رہتے ہیں"۔

"تمھارا ملک بھی عجیب ملک ہے" مریم کی داستان سن کر میں نے کہا۔

"میرا ملک نہیں" مریم نے میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میرے ملک کی حکومت عجیب ہے۔ اور عجیب کا لفظ تو اس کے لیے بہت چھوٹا ہے۔ اسے سو سے ضرب دیا جائے تو شاید بات بنے"۔

"اچھا تو تین روحیں ہیں کہاں؟" میں نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

"ہوا کا رخ دیکھنے کے لیے انھیں میں نے نیچے ہی بٹھا دیا ہے" میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے مریم نے پوچھا "اور تم یہاں اوپر تک کیسے پہنچے؟"

"بار کے منیجر نے رہنمائی کی۔"

"منیجر نہیں" مریم نے بتایا "بار مالک ہے، اور پارٹی ممبر بھی ہے۔ یہ خطبی ہے اور اس کا نام ایڈون ہے۔"

"یہ تو میں کمرہ دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ کسی کمیونسٹ کا کمرہ ہے۔"

"ایک بات کا خیال رکھنا" مریم نے گھنٹی کا بٹن دباتے ہوئے کہا "ان لوگوں کے سامنے مجھ سے بے تکلفی قطعاً نہ برتنا۔ اور ہاں مجھے مریم نہیں، کیپٹن میری کہہ کر مخاطب کرنا۔"

مریم یہ ہدایتیں دے رہی تھیں کہ کسی نے دروازہ تھپ تھپایا۔

"آجاؤ" مریم نے اپنا اسکرٹ درست کرتے اور ہٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ لوگ کیا کر رہے ہیں، کامریڈ ایڈون" مریم نے سوال کیا "اب تو خطرہ ٹل گیا ہے۔ ان لوگوں کے اوپر آنے میں اب کوئی مضایقہ نہیں ہے میرے خیال میں۔"

"ہال کے سامنے ہی بیٹھے بیئر پی رہے ہیں" ایڈون نے جواب دیا "کچھ دیر اور انھیں وہیں رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔"

"اچھا تم نے انھیں بیئر کیوں دی؟" مریم نے ایڈون سے سوال کیا "بلیک اینڈ کی بوتل کہاں ہے، جو کل میں دے گئی تھی؟"

"کامریڈ وہ تو کل رات ہی کو ختم ہوگئی تھی" ایڈون نے جواب دیا "بوتل میں نے شلف پر کتابوں کے پیچھے رکھ دی تھی۔"

"اور وہ گر کر ٹوٹ گئی!"

"نہیں ٹوٹی نہیں" ایڈون نے صورت حال کی وضاحت کی "رات غیر متوقع طور پر کچھ لوکل کامریڈ آ گئے۔ ان کی نظر اس پر پڑ گئی۔ انھوں نے میری ایک نہ سنی اور ختم ہی کر کے چھوڑی، لیکن میرے پاس واٹ ۶۹، وہائٹ ہارس، امریکن وہسکی اور اصلی ووڈ کا بھی ہے۔"

"اور کھانے کا انتظام کیا تم نے؟" مریم نے مزید سوال کیا "میں بھوکی ہوں اور خالی پیٹ میں وہسکی راکٹ کی طرح سر کی طرف جاتی ہے۔ میں سب کے سامنے مدہوش ہونا نہیں چاہتی۔"

"اچھا کھانا آنے سے پہلے کھانے کے لیے کچھ بھیجتا ہوں اور پینے کے لیے کیا بھیجوں؟"

"میرے لیے واٹ ۶۹۔"

"اور آپ کے لیے؟" ایڈون مجھ سے مخاطب ہوا۔

"سوڈا اور بہت سی برف بھی۔"

"سوڈا اور بہت سی برف بھی؟" مریم نے حیرت سے میرے جملے کو دہرایا۔

"ہاں۔"

"یہ تو وہسکی کی توہین ہے" مریم نے احتجاجی لہجے میں کہا "وہسکی یا تو نیٹ (خالص) پینی چاہیے، یا زیادہ سے زیادہ سادے پانی کے ساتھ۔"

بیس پچیس منٹ کے بعد مریم کے ساتھی بھی کھانے کے ساتھ کمرے

میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک خاتون بھی تھیں۔ ایک دوسرے سے ہمارا تعارف ہوا۔

"اب تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟" مریم نے اپنے ساتھیوں سے سوال کیا۔

"ایسے موقعوں پر خطرہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا" ان کی ساتھی مسز والٹر نے جواب دیا "اس موضوع پر اب گفتگو کرنا بے سود ہے۔"

"ہاں تم نے بالکل ٹھیک کہا" مریم نے مسز والٹر کی تائید کی، "اب اس موضوع پر گفتگو کرنا بے سود ہے۔ اس وقت تو ہم صبح تک یہاں بیٹھ سکتے ہیں۔"

"صبح تک نہیں" مسز والٹر ہی نے ٹوکا "زیادہ سے زیادہ نو بجے تک۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے ڈنر پارٹی شروع ہو جائے گی۔"

"مجھے نہیں جانا" مریم نے کہا "میں نے کل ہی نوٹس دے دیا تھا۔"

"تو آج کا پروگرام تم نے بہت پہلے بنا لیا تھا" مریم کے ایک ساتھی نے کہا "اور ہم لوگوں کو بتایا ہی نہیں۔"

"پروگرام پرسوں شام ہی کو بنا تھا" مریم نے تاویل کی "کل صبح مجھے سویز جانا پڑا۔ واپسی رات کو ہوئی۔ اور آج صبح تم لوگ ملے نہیں۔"

"بہرکیف" مسز والٹر نے شکایتاً کہا "ہم لوگوں کو پہلے سے معلوم ہوتا تو ہم بھی اپنی آج کی شام خالی رکھتے۔"

"کامریڈ" مریم نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا "اچھا یہ بتایئے۔"
مریم کا سوال ابھی پورا نہ ہوا تھا کہ ایڈون کمرے میں داخل ہوا اور سب کی نظریں ایڈون کی طرف گھوم گئیں۔

"ساؤتھ امریکن ملٹری پولیس کی گاڑی دو بار ہوٹل کے سامنے سے گزر چکی ہے" ایڈون نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "بہتر یہ ہے کہ اس وقت یہاں سے ٹل جایئے۔ میں آپ کو پیچھے کے زینے سے نیچے پہنچادوں گا۔ اور آپ لوگ نیچے چل کر ہال میں ایک کونے میں بیٹھ جایئے۔"

میں نے اور مریم نے ایک دوسرے کی طرف بے بسی کے ساتھ دیکھا۔

"آپ مجھے اپنا ٹیلیفون نمبر دے دیجیے" مریم نے آخری بات کہی "اگلی ملاقات کے پروگرام کی میں آپ کو اطلاع دوں گی۔"

اس ملاقات کے دو دن بعد سہ پہر کو اگلے ہفتے کے اخبار کی ڈمی بنا رہا تھا، جسے کل ہی پریس جانا تھا کہ بیجر سبرانیم نے مجھے آواز دی۔

"تمھارا ٹیلیفون ہے۔"

"اس طرف کون ہے؟"

"معلوم نہیں، کسی عورت کی آواز ہے۔"

"ہلو" ریسیور اٹھاکر میں نے مخاطب کیا۔

"ہاں میں بول رہا

"مریم؟"

"ہاں تمھاری بدنصیب دوست مریم۔"

"کہاں سے بول رہی ہو؟"

"اے، بی، سی (ائر بکنگ سنٹر) سے۔ میں یہاں سے آدھ گھنٹے بعد ائر پورٹ اور وہاں سے سائپرس (قبرص) کے لیے روانہ ہوں گی۔"

"میری سمجھ میں تمھاری بات نہیں آ رہی ہے۔"

"بس تم آجاؤ فوراً، میں زبانی سمجھا دوں گی۔ آ رہے ہو نا؟"

"اچھا، میں آ رہا ہوں۔"

"میں سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں ہوں، تم سیدھے وہیں آجانا۔"

"کیا بات ہے؟" میجر سبرامنیم نے سوال کیا۔ "بہت گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے ہو!"

"بڑا نازک معاملہ ہے میجر، مجھے فوراً اے، بی، سی جانا ہے۔"

"اخبار پورا ہو گیا۔"

"نہیں کچھ باقی ہے۔"

"اب تم ہی فیصلہ کرو کہ اخبار پورا کرنا ضروری ہے یا نوجوان خاتون کو خدا حافظ کہنا؟"

"میجر یہ معاملہ دل کا ہے، نہ بھی گیا تو کام تو کر نہ سکوں گا۔ لیکن کل صبح دس بجے تک اخبار پریس چلا جائے گا۔"

"آخر بات کیا ہے؟"

"بات کل بتاؤں گا۔"

"اچھا جاؤ، مگر اخبار کل صبح چلا جائے پریس۔"

"شکریہ میجر، اے، بی، سی تک جانے کے لیے میں گاڑی لے رہا ہوں۔"

"مگر فوراً واپس کر دینا، مجھے بھی جانا ہے۔ روکنا نہیں گاڑی۔"

"بہت بہتر ہے۔"

میں نے ٹوپی اٹھائی اور کاغذات کو منتشر حالت میں میز ہی پر چھوڑ کر چل کھڑا ہوا۔

"خدا کا شکر ہے تم نے دیر نہیں کی" مریم نے دیکھتے ہی کہا جو مینیجر کے دفتر کے دروازے ہی سے لگی کھڑی تھیں۔ اس وقت ان کے چہرے کی قدرتی سرخی سفیدی میں بدل چکی تھی۔

"یہ قصہ کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہماری ملاقاتوں کی رپورٹ آفیسر کمانڈنگ کے پاس پہنچ گئی تھی۔"

"تو پھر؟"

"کل صبح کو آفیسر کمانڈنگ نے مجھ کو بلایا۔ وہ آدمی شریف اور میرا دور کا عزیز بھی ہے اور پارٹی کا ہمدرد بھی ہے۔ اس نے جب پوچھا تو میں نے سچی بات اسے بتا دی۔ اب چھپانا تھا بھی بے سود۔ خیریت یہ ہوئی کہ اس قصے سے ایک دن پہلے ہی میرے قبرص کے تبادلے کے احکام بھی آ گئے تھے۔ چناں چہ اس رپورٹ پر کارروائی کرنے کی جگہ پر آج میرے سائپرس جانے کا حکم دے دیا اور وہ رپورٹ ضایع کر دی۔"

"یہ بھی اچھا ہوا۔"

"اگر تبادلے کا معاملہ نہ آ گیا ہوتا، تو کوئی نہ کوئی کارروائی

میرے خلاف ضرور کی جاتی" پھر کچھ رک کر مریم نے کہا " یہ دن آج نہیں تو ہفتہ دس دن بعد تبادلہ ہونا ہی تھا۔ ہاں ملٹری پولیس والے بیچ میں نہ پھاندپڑتے تو پچھلے سنیچر کی رات یقیناً ہماری گولڈن نائٹ ہوتی اور کم از کم ایک دو ملاقاتیں اور ہو جاتیں۔"

"پندرہ بیس دن بعد مجھے ایک ہفتے کی چھٹی مل سکتی ہے۔ چلو تمھاری بدولت سائپرس کی بھی سیر ہو جائے گی۔"

"دیکھو تم وہاں آنے کا ہرگز ارادہ نہ کرنا" مریم نے تاسف اور گھبراہٹ کے ملے جلے لہجے میں کہا "وہاں جو کیمپ کمانڈنٹ ہے، پکا سفید دکنی افریقی ہے۔ میری تو وہ جان ہی لے لے گا۔"

"ہم دونوں چھٹی لے کر فلسطین میں یا کسی اور جگہ مل سکتے ہیں۔"

"لیکن یہ جلد ممکن نہ ہو سکے گا۔"

"اچھا وہاں پہنچ کر تم مجھے تفصیلی خط لکھنا"

"براہ راست نہیں، بلکہ اپنی ایک دوست کی معرفت لکھوں گی۔ وہ بھی آتی ہی ہوں گی۔ میں ان سے ملادوں گی۔ پوری صورت حال میں نے انھیں سمجھادی ہے ـــ دیکھو وہ آگئیں۔ یہ فوجی بھی نہیں ہیں اس لیے انھیں وہ خطرات بھی لاحق نہ ہوں گے، جو مجھے ہیں۔"

"یہی میرے دوست ہیں، جن کا میں نے تم سے آج یہاں

آتے ہوئے ذکر کیا تھا" مریم نے تعارف کراتے ہوئے کہا "اور یہ میری دوست فلس ریپکن ہیں۔ اقوام متحدہ کے امدادی ادارے اَن رَا (UNRRO) سے وابستہ ہیں۔ ان ہی کو میں خط لکھوں گا، جو حقیقتاً تمھارے نام ہوگا۔ یہ تمھیں دے دیں گی۔ اور تم بھی ان ہی کے نام خط بھیجنا۔"

"بڑی خوشی ہوئی، آپ سے مل کر" فلس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "آپ دونوں کی ممکن خدمت کرنے کی کوشش کروں گی۔ یقین ہے کہ ہم دونوں اچھے دوست بھی بن سکیں گے۔"

الہند فی شرق الاوسط

کیپٹن مریم کے قبرص جانے کے چند ہی روز بعد فخری شہاب سے غیر متوقع ملاقات میرے لیے حقیقی معنوں میں 'ملاقات مسیحا و خضر' سے کہیں بہتر ثابت ہوئی۔ اس ملاقات نے اس خلا ہی کو پر نہیں کیا جو کیپٹن مریم کی ناگہانی مفارقت نے پیدا کیا تھا، بلکہ مصر میں میرے قیام کی نوعیت ہی سرے سے بدل دی۔

فخری غریب شہر ہونے کے باوجود، راڈیو بغداد کے سابق ڈائرکٹر جنرل ہونے کی نسبت سے قاہرہ میں خاصے متعارف تھے۔ ان کی وساطت سے مصر کے اکثر صحافیوں، ادیبوں اور اعلیٰ شہریوں سے میری بھی ملاقات ہوئی۔ ان میں دو نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں —— ایک عبدالمجید مجدی کا اور دوسرا محمد عبدالقادر المازنی کا۔ مجدی مصری ریلوے میں اسسٹنٹ چیف انجینیر تھے۔ المازنی مصر ہی نہیں، عرب دنیا کے معروف و مقبول صحافی اور وفد پارٹی کے اخبار روزنامہ 'المصری' کے خصوصی کالم نگار تھے۔

مصر کی عام بول چال میں 'ج' کی آواز 'گ' سے اور 'ق' کی 'الف' سے بدل جاتی ہے۔ چناں چہ وہاں مجید مجدی 'مگید مگدی' اور عبدالقادر 'عبدالآدر' بن جاتے ہیں۔ 'مگید مگدی' مجھے پہلے ہی دن کچھ عجیب سا معلوم ہوا تھا، لیکن اس وقت تک 'ج' کے صوتی اُلٹ پھیر سے میں واقف نہ ہوا تھا، اس لیے عرصے تک میرا ذہن اصل نام کی طرف منتقل نہ ہو سکا۔ ایک دن خود مگدی نے اپنا نام عربی رسم خط میں لکھا، تو ان کے نام کی حقیقت کھلی۔

فخری نے پہلی ہی ملاقات میں مجدی کا مجھ سے ذکر کیا تھا، جو ان کے پڑوسی تھے، لیکن عرصے تک ان سے ملاقات کی نوبت نہ آسکی۔ ایک دن بلا اطلاع فخری انھیں میرے کیمپ میں لے آئے۔ پھر وہیں سے اٹھ کر ہم ان کے گھر گئے، جو ہمارے کیمپ سے زیادہ دور نہ تھا۔ اپنی بیوی زُو زُو سے تعارف کرایا، جن کا اصلی نام زینب تھا۔ مغربی تعلیم، مغربی رہن سہن اور مغربی وضع قطع کے باوجود میاں بیوی دونوں نہایت خلیق، ملن سار اور خالص مشرقی نکلے۔ مصریوں کو عام طور پر لطیفے سننے اور سنانے سے خاص دل چسپی ہوتی ہے۔ مجدی کو بھی لطیفہ گوئی کا بڑا ملکہ تھا۔ باتیں بھی بڑی دل چسپ کرتے تھے۔ بس جی چاہتا:

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

اپنے متعلق کہا کرتے تھے فرایض منصبی ادا کرنے کے علاوہ میرے دو محبوب مشغلے ہیں، اور دونوں غیر شاعرانہ —— "بیوی سے محبت کرنا اور موٹر کی مرمت۔" فرصت کے بیش تر اوقات عموماً اور چھٹی کا

دن خصوصاً ان ہی دونوں مشغلوں میں وہ گزار دیتے۔ بیوی تو عاجز آکر ان سے اپنا پیچھا چھڑا لیتیں، لیکن جب بے زبان موٹر کا نمبر آتا تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر گھنٹوں اسی میں گم رہتے۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ موٹر سے اکتا کر گیراج سے باہر نکلتے تو بیوی گھر میں نہ ہوتیں۔ اس وقت پنسل اور کاغذ لے کر بیوی اور موٹر کی تصویریں بناتے۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ موٹر کی اور میری ازدواجی زندگی کی عمر ایک ہی ہے، اور دونوں نے آج تک مجھے دھوکا نہیں دیا ہے۔

المازنی چوٹی کے صحافی اور ادیب تھے۔ مصر ہی میں نہیں، ساری عرب دنیا میں ان کے قلم کی دھوم اور ان کی صحافتی اور ادبی حیثیت مسلم تھی۔ مصر کی سماجی زندگی کے تمام طبقوں میں انھیں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور ان کی رائے کی بڑی وقعت تھی۔ بذلہ سنج، مرنجاں مرنج، کھانے کھلانے اور پینے پلانے میں بڑے حاتم تھے۔ فخری ہی کے ساتھ ایک دن میں ان کے گھر گیا، اور پہلی ہی ملاقات میں ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ باتوں کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔

"مشرق اوسط کے محاذ جنگ کا جہاں تک تعلق ہے، قاہرہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے" باتیں کرتے ہوئے میں نے المازنی سے کہا "پورے مشرقی محاذ کی رسد رسانی کے لیے اتحادیوں کے فوجی نظام کا مرکز قاہرہ ہی ہے۔ برطانیہ اور امریکا کے بڑے بڑے دفاتر بھی یہیں ہیں۔ قاہرہ اور اس کے نواح میں برطانوی امریکی اور ہندستانی فوجیوں کے علاوہ آسٹریلیا،

نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ اور نہ جانے کہاں کہاں کے فوجی بڑی کثرت سے قاہرہ میں نظر آتے ہیں۔"

"اتحادیوں کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بھی اب قاہرہ ہی بن گیا ہے" فخری نے میری تائید کرتے ہوئے کہا "۱۹۴۳ء کے اواخر میں پریسیڈنٹ روزولٹ، وزیر اعظم چرچل، جنرل اِنہ موچنگ کائی شیک اور صدر عصمت اِنونو کی کانفرنس بھی یہیں قاہرہ میں ہوئی تھی۔ اتحادیوں کی کامیابی میں، جو اب یقینی ہوگئی ہے، قاہرہ کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔"

"ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ" المازنی نے کہا "یہ بات بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ ہندستانی اور عراقی عوام کی طرح مصری عوام کو بھی اتحادیوں کی کامیابی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان سب ملکوں کو برطانیہ سے جو نفرت تھی، اس جنگ کے دوران اس کی شدت میں اضافہ ہوا ہے۔"

یہ کہہ کر المازنی چپ ہو گئے اور سامنے دیوار پر ٹنگے ہوئے نقشے کو اس طرح گھورتے رہے، جیسے کسی خیال میں گم ہوں۔ میں اور فخری بھی خاموش رہے۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں" کچھ دیر بعد المازنی نے نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس جنگ کے بعد اب دنیا کا جو نیا سیاسی نقشہ بنے گا، یا عالمی سیاست کی جو نئی بساط بچھائی جائے گی، اس میں مشرق کو بڑی اہمیت حاصل ہوگی۔"

"میرا تو خیال ہے" المازنی کی تائید کرتے ہوئے میں نے

کہا "مشرق کی آنے والی تاریخ کو بنانے یا بگاڑنے میں ہندستان اور مشرق اوسط کے تعلقات کو عموماً، اور ہندستان و مصر کے تعلقات کو خصوصاً، بہت کچھ دخل ہوگا۔"

"یہ خیال بالکل صحیح ہے" فخری نے میری تائید کی۔

"ہندستان اور مشرق اوسط کے قدیم تجارتی، تہذیبی اور سیاسی تعلقات کی روشنی میں مستقبل کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔" المازنی نے کہا۔

"یقیناً بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے" میں نے المازنی سے اتفاق کیا۔

"تو لکھنے کا کام آپ کیجیے" المازنی نے تجویز پیش کی "فخری اس کام میں آپ کی مدد کریں اور میں اس کا ترجمہ عربی میں کروں گا۔"

دوسری ملاقات میں ہم لوگوں نے اس موضوع کے حدود متعین کیے اور تیسری ملاقات میں اس کا خاکہ تیار کر لیا۔ پندرہ بیس دن میں مضمون تیار ہو گیا، جو تین حصوں پر مشتمل تھا:

۱۔ ہندستان اور مشرق اوسط کے قدیم تجارتی و ثقافتی تعلقات۔
۲۔ ہندستان اور مشرق اوسط کے موجودہ تعلقات۔
۳۔ ہندستان اور مشرق اوسط کے آئندہ تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی۔

المازنی نے حسب وعدہ اس کا عربی میں ترجمہ کیا اور روزنامہ المصری میں "الہند فی شرق الاوسط" کے عنوان سے اور "صحفی ہندی" کے

نام سے تین قسطوں میں شایع ہوا۔ معاوضے میں تیس پونڈ ملے (اس وقت مصری پونڈ کی قیمت تیرہ روپے دس آنے تھی) اس رقم سے ہم نے اپنی شان دار دعوت کی۔

مضمون اگرچہ میرے نام سے شایع نہیں ہوا تھا، تاہم اس کی اشاعت میرے لیے انتہائی دوررس، اور یک سر غیر متوقع، نتائج کی حامل ثابت ہوئی۔ اس نے مصر میں میرے قیام کی نوعیت ہی بدل دی اور مصر ہی میں 'فوجی' سے میں 'شہری' بن گیا۔ اس کی اشاعت کے دو ہی تین بعد فخری کے ایک دوست عبدالمجید، جو عراق کے زرعی بینک کے ڈائرکٹر تھے، عرب لیگ کی اقتصادی کمیٹی کے جلسے میں شرکت کے لیے بغداد سے قاہرہ آئے۔ فخری نے رات کے کھانے پر انھیں مدعو کیا۔ مجھے اور المازنی کو بھی فخری نے ان سے ملنے کی دعوت دی۔

"ہندستان اور مشرق اوسط کے روابط کے بارے میں کسی ہندستانی جرنلسٹ کا ایک طویل مضمون (المصری میں شایع ہوا ہے" عبدالمجید نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہا۔

"فخری اور المازنی نے بھی اس کا مجھ سے ذکر کیا ہے" میں نے اس مضمون سے اپنی لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کو معلوم ہے، کس نے لکھا تھا یہ مضمون؟"

"نہیں، مجھے اس کا علم نہیں ہے۔"

"یہ تو اللہ کے گدھے ہیں" فخری نے ایک عربی مثل دہراتے ہوئے بھانڈا پھوڑ دیا "مضمون ان ہی کا لکھا ہوا ہے۔ ترجمہ

المازنی نے کیا تھا۔"

"مجھے بڑی خوشی ہوئی یہ معلوم کر کے" عبدالمجید نے کہا "مگر اس میں چھپانے کی کیا بات تھی؟"

"میں فوجی ہوں" میں نے وضاحت کی "اگر میرے محکمے کو معلوم ہو جائے تو میرا کورٹ مارشل بھی ہو سکتا ہے۔"

"آپ کے محکمے کو تو نہیں" عبدالمجید نے کہا "لیکن میں عزام پاشا کو ضرور بتاؤں گا۔ انھوں نے آج ہی اس کا مجھ سے ذکر کیا تھا۔ مضمون کی وہ بے حد تعریف کر رہے تھے۔ المصری کے اڈیٹر کو بھی انھوں نے ٹیلیفون کیا تھا، لیکن وہ بھی یہ نہ بتلا سکے کہ یہ مضمون کس نے لکھا تھا۔ اگر آپ کی مصلحت اجازت دے، تو آپ عزام پاشا سے ملیے بھی۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔"

"عزام پاشا کی شخصیت میں مجھے بھی خاصی کشش محسوس ہوتی ہے" میں نے جواب دیا "میں ان سے ضرور ملوں گا۔"

"میں انھیں ابھی ٹیلیفون کرتا ہوں" عبدالمجید نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "اور آپ کی ملاقات کا وقت مقرر کرائے دیتا ہوں۔"

دوسرے دن، پہلے وقت کا دفتر ختم کر کے، ٹھیک دو بجے عرب لیگ کے دفتر پہنچا۔ صدر دروازے سے گزر کر وسیع چبوترے پر میں نے قدم رکھے ہی تھے کہ ایک باوردی سوڈانی دربان نے عربی میں کچھ

کہا، جو میں بالکل سمجھ نہ سکا۔
"عزام پاشا" میں نے اپنے اندازے کے مطابق جواب دیا۔
"فدّل" احتراماً سر جھکاتے ہوئے اس نے کہا اور ایک قریبی دروازے کے پٹ کھول دیے۔

"آپ مسٹر صدیقی ہیں؟" ایک خوش رو اور خوش پوش نوجوان نے مجھے دیکھتے ہی انگریزی میں سوال کیا۔ مخاطب کے انداز اور کمرے کے ماحول سے میں سمجھ گیا کہ یہ عزام پاشا کے سکریٹری ہیں۔
"ہاں آپ کا خیال صحیح ہے"۔ ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے جواب دیا۔
"تشریف رکھیے" ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نوجوان نے کہا۔ "آپ بالکل صحیح وقت پر آئے ہیں"۔ اس کے ساتھ ہی ٹیلیفون کی اندرونی گھنٹی کا بٹن دبا کر اس نے عزام پاشا کو میری آمد کی اطلاع دی۔

عزام پاشا کے کمرے میں داخل ہوا تو قوی الجثہ اور تنددمند مصری پاشاؤں کے برعکس ایک متوسط القامت اور دبلا پتلا انسان میرے سامنے تھا۔ ان کے خدوخال اور ان کا زردی مائل سفید رنگ اس کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ افریقی النسل مصری نہیں ہیں، بلکہ ان کی رگوں میں ان ترکوں کا خون ہے، جنھوں نے ایک عرصے تک مصر پر حکمرانی کی تھی۔ ان کا لب ولہجہ نرم وشیریں تھا اور ان کی گفتگو کے انداز میں خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ انکساری بھی تھی، جو مخاطب کو بہ آسانی گرویدہ بنا لیتی ہے۔

بڑی گرم جوشی سے انھوں نے مصافحہ کیا۔ رسمی گفتگو اور المصری والے مضمون کا ذکر کرنے کے بعد ہندستان کی سیاسی صورت حال سے متعلق سوالات کرتے رہے۔

"برطانوی سیاست کا ہمیں بھی خاصا تجربہ ہے" عزام پاشا نے میرے جوابوں کو سننے کے بعد کہا "ان کے ہتھکنڈوں سے ہم بھی خوب واقف ہیں۔ اس کی بہت اچھی مثال فلسطین کا مسئلہ ہے۔"

"فلسطین کے مسئلے سے ہندستانی مسلمانوں ہی کو نہیں ہندستان کی بیش تر سیاسی پارٹیوں کو، خصوصاً انڈین نیشنل کانگرس کو، گہری دل چسپی ہے۔"

"فلسطین ہی کے مسئلے سے نہیں" عزام پاشا نے کہا "عالم اسلام کے ہر مسئلے سے ہندستانی مسلمانوں کو اور انڈین نیشنل کانگرس کو گہری دل چسپی رہی ہے۔"

"مشرق کے برے دن غالباً اب ختم ہو چکے ہیں" میں نے کہا "اس جنگ کے بعد دنیا کا کوئی ملک بھی شاید غلام نہ رہے گا۔"

"مگر سوال یہ ہے" عزام پاشا نے سر کھجاتے ہوئے کہا "برطانیہ کا تسلط ختم ہونے کے بعد جو خلا پیدا ہوگا، اسے پر کرنے کے اہل ہم خود کس حد تک ثابت ہوتے ہیں؟ مشرق دنیا کا ایک وسیع خطہ ہے۔ میں آپ کے اس خیال سے کلیتاً متفق ہوں کہ مشرق نام ہے ایشیا مثبت افریقہ کا۔ نیز یہ کہ مغرب میں ایشیا کے حدود جزیرۃ العرب سے نہیں بلکہ مصر سے

شروع ہوتے ہیں۔ اور آپ نے یہ بھی بالکل صحیح لکھا ہے کہ عرب اور افریقہ کے ملکوں اور ہندستان کے قریبی سیاسی تعلقات ہی پر مشرق کے مستقبل کا بڑی حد تک انحصار ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر عرب لیگ میں ہندستان کا ایک شعبہ میں قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اس شعبے کی ذمے داری اگر آپ لے سکیں تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"اس پیش کش کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں" عزام پاشا کی اس غیر متوقع تجویز کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے جواب دیا "مگر میرا تعلق فوج سے ہے اور فوجی ملازمت سے سبک دوش ہونا میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

"اس کی فکر آپ نہ کیجیے" عزام پاشا نے پُر اعتماد لہجے میں کہا "یہ کام میرا ہے۔"

"تو میں اس خدمت کے لیے بہ خوشی تیار ہوں۔"

"آپ کے اس فیصلے سے مجھے خوشی ہوئی۔" رخصت ہوتے وقت عزام پاشا نے میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "نہ جانے کیوں مجھے آپ سے یہی امید تھی۔ اور سب سے زیادہ خوشی مجھے اس سے ہوئی کہ نہ تو آپ نے فیصلہ کرنے میں دیر کی اور نہ معاوضے کی بحث ہی آپ نے چھیڑی۔"

یہ تھی عزام پاشا سے میری پہلی ملاقات، جو خوش گوار ہی نہیں بلکہ کامیاب رہی۔ جنگ اس زمانے میں عملاً ختم ہو چکی تھی، اور مشرق اوسط سے ہندستانی فوجیوں کی واپسی کا عمل شروع ہونے ہی

دالا تھا۔ اس نے عزام پاشا کے کام کو بہت حد تک آسان بنا دیا۔

اس ملاقات کے پانچ ہفتے بعد ـــــ وسط فروری ۱۹۴۶ء میں، انڈین آرمی پبلک ریلیشنز کے ہیڈکوارٹرس نے مجھ سے دریافت کیا کہ عرب لیگ کی ملازمت میں داخل ہونا اور ہندستان سے باہر مصر میں فوجی ملازمت سے سبک دوشی میں پسند کروں گا یا نہیں؟ اس کا جواب میں نے اثبات میں لکھ دیا اور اس کی ایک نقل عرب لیگ کو بھی بھیج دی۔

دردوداغ وسوزوسازوآرزو

مارچ ۱۹۴۶ء کے پہلے ہفتے میں نئی دہلی کے ہیڈ کوارٹرس نے اطلاع دی کہ ہمارے بغداد کے دفتر کے انچارج تین ہفتوں کی رخصت پر جا رہے ہیں، اس لیے مجھے فوری طور پر بغداد جانا ہے۔ اس تبدیلی کا مجھ پر کوئی ناخوش گوار اثر نہ ہوا کیوں کہ معاملہ صرف تین ہی ہفتوں کا تھا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بغداد میں کام بھی برائے نام رہ گیا ہے۔ لیکن میری عارضی تبدیلی کی خبر سے فخری کو بے حد خوشی ہوئی۔

"آج رات کو تم اور صبیحہ میرے ساتھ کھانا کھاؤ" بغداد روانہ ہونے سے ایک روز قبل فخری کو میں نے ٹیلیفون کیا "مجدی اور زُوزُو کو بھی ساتھ لیتے آنا۔ میں ان کو بھی ٹیلیفون کر رہا ہوں۔"

"نہیں" فخری نے جواب دیا "آج رات کا کھانا صرف ہم دونوں ساتھ کھائیں گے۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں، جو کسی اور کی موجودگی میں نہ ہوسکیں گی۔ کھانا کابی نُویں کھائیں گے۔"

کاسی نو ہمارے کیمپ اور فخری کے گھر سے قریب ہی نیل کے کنارے ہے۔ ہم دونوں اس رقص گاہ کے اندرونی حصے میں نہیں بلکہ اس کی چھت پر چلے گئے، اور ایک ایسا گوشہ سنبھال لیا جو نیل کے بالمقابل تھا۔ چاند صاف و شفاف آسمان پر اور اس کا عکس نیل کی ساکن سطح پر پوری آب و تاب سے ضو فگن تھا۔ کاسی نو کی چھت پر چاند کی اجلی سی چادر بچھی تھی، شاید اسی لیے ساری روشنیاں گل کر دی گئی تھیں۔ صرف وسط میں کچھ بلندی پر بجلی کا ایک رنگین قمقمہ، نہ جانے کیوں روشن کر دیا گیا تھا جو چاند کی قدرتی روشنی کا منہ چڑا رہا تھا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی، جو ماحول کی رومانیت میں اضافہ کر رہی تھی۔ چھت پر بیشتر خالی میزیں ان زندہ دلانِ قاہرہ کی منتظر تھیں، جو ابھی رقص گاہ کے اندرونی حصے کی رنگ رلیوں میں محو تھے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک لحیم شحیم رنگین مزاج مصری ایک صوفے پر نیم دراز تھے۔ یہ مصر کی عدالت عالیہ کے سابق جج اور قاہرہ کی رنگین محفلوں کی جان سمجھے جاتے تھے۔ ایک نوجوان رقاصہ اس طرح ان کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی، جیسے وہ بھی ان کے وجود کا ایک ضروری جزو ہو۔

"یہ منظر مجھے بغداد کی یاد دلاتا ہے" فخری نے نیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "وہ دیکھو نیل کے اس پار، کونے پر سمیر امس ہوٹل ہے۔ بغداد میں بھی دجلہ کے کنارے سمیر امس ہوٹل ہے۔ اتنا بڑا اور اتنا شان دار تو نہیں ہے، لیکن میری زندگی کی بہت سی یادیں اس سے وابستہ ہیں۔"

اسی سلسلے میں فخری نے اپنی حیات معاشقہ کا وہ المیہ بھی سنایا، جس نے صرف ان کی اپنی ہی زندگی کے سکون کو نہیں، بلکہ ان کی اجتماعی خانگی زندگی کے سکون کو بھی درہم برہم کر دیا تھا۔ اس المیے کا پلاٹ، کم و بیش وہی تھا، جو مشرق کے بیش تر ناکام معاشقوں کا ہوا کرتا ہے۔ ان کی لیلا بھی ان ہی کی طرح ایک ترکی النسل عراقی حسین و جمیل دوشیزہ تھی۔ ان دونوں کے تعلقات اس منزل تک پہنچ گئے، جہاں سے واپسی کی راہیں بالعموم مسدود ہو جاتی ہیں۔ لیکن غیر متوقع طور پر واقعات کے دھاروں نے ایسا رخ اختیار کیا کہ وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ ہو سکے۔ فخری تو اس حادثے کو کسی نہ کسی طرح جھیل گئے، لیکن ان کی محبوبہ کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

اس غم کو غلط کرنے کے لیے فخری نے ایک دوسری خاتون صبیحہ کی آغوش میں پناہ لی، جو بے یار و مددگار اور سماجی اعتبار سے ان سے فروتر تھی۔ اپنی نابینا ماں اور خاندان کے دوسرے افراد کی انتہائی مخالفت کے باوجود انھوں نے اسے شریک زندگی بنا لیا۔ لیکن فخری کی ماں نے صبیحہ کو اپنے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہ دی۔ اسی بنا پر فخری کو بغداد چھوڑتے وقت بیوی کو بھی اپنے ساتھ قاہرہ لے جانا پڑا۔ لیکن قاہرہ کے گراں بار اخراجات کے پیش نظر وہ صبیحہ کو بغداد واپس بھیجنا چاہتے تھے، بہ شرطے کہ ان کی والدہ اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ ہوں، جنھیں فخری سے اب بھی بے پناہ محبت تھی۔

"بغداد پہنچتے ہی یہ خط میرے گھر بھجوا دینا" ہوائی جہاز کے پرواز کرنے سے چند منٹ پہلے ایک بھاری سا لفافہ میرے حوالے کرتے ہوئے، فخری نے کہا، جو مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے ائر پورٹ تک میرے ساتھ آئے تھے۔" اور جلد سے جلد جا کر میری ماں اور بہن سے ضرور مل لینا۔ اس خط میں اپنے اور تمھارے تعلقات کا تفصیلی ذکر کر دیا ہے۔ لفافے پر پتہ اور ٹیلیفون نمبر لکھا ہے، تم بھی اسے نقل کر لینا۔"

"میں ضرور جاؤں گا۔"

"میری ماں فارسی بھی خوب بول لیتی ہیں، ان سے گفتگو کرنے میں تمھیں دقت نہ ہوگی۔ اور خالدہ تو بغداد یونیورسٹی کی گریجویٹ اور قانون کے آخری سال کی طالب علم ہے۔ اور ہاں ——"

"اٹنشن پلیز" فخری کا جملہ ابھی پورا بھی نہ ہوا تھا کہ ائر پورٹ کے مایکروفون نے مسافروں کو مخاطب کرتے ہوئے اطلاع دی "بغداد جانے والا جہاز تیار ہے۔"

بغداد پہنچتے ہی پہلی بات یہ محسوس ہوئی کہ وہاں کی دنیا بڑی حد تک بدل چکی ہے۔ ایک سال پہلے جو فوجی ہماہمی وہاں نظر آئی تھی، اس کے اب صرف آثار ہی باقی رہ گئے تھے۔ فوجیوں کی مراجعت وطن کے عمل نے، دفتری اعتبار سے، بصرے کی اہمیت زیادہ بڑھا دی تھی اور بیشتر دفاتر بصرے ہی منتقل کر دیے گئے تھے۔ جو تھے بھی ان میں کام کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ خود

ہمارا دفتر اب ایک ٹائپسٹ، ایک کلرک، ایک فوٹوگرافر اور ایک چپراسی ہی پر مشتمل تھا۔ موخرالذکر دونوں فوجی نہیں سویلین تھے۔

بغداد پہنچتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ فخری کا خط عراقی چپراسی کی معرفت ان کے گھر بھیج دیا۔ لفافے کی پشت پر میں نے اپنا نام اور ٹیلیفون نمبر بھی لکھ دیا تھا۔ خط ملتے ہی خالدہ نے ٹیلیفون کیا کہ ان کی ماں بے تابی سے میرا انتظار کر رہی ہیں۔

"میں کل شام کو آؤں گا۔"

"نہیں" خالدہ نے اصرار کیا "میری والدہ کہہ رہی ہیں کہ آج ہی آیئے، اور آپ نہ آئے تو وہ خود آپ کے پاس آئیں گی۔"

"اچھا ساڑھے چھ بجے کے قریب میں پہنچوں گا۔"

ساڑھے چھ بجے کے قریب جب میری جیپ مسجد امام اعظم کے سامنے پہنچی تو ایک نوجوان خاتون نے ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کیا۔ یہ فخری کی بہن خالدہ تھیں، جو لباس اور وضع قطع کے اعتبار سے جدید عراق کی نمائندہ خاتون معلوم ہوتی تھیں۔ انھوں نے بڑھ کر گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور میں ان کی رہنمائی میں پیدل ان کے گھر کی طرف بڑھا، جو مسجد سے پچیس تیس گز کے فاصلے پر تھا۔

فخری کی ماں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھی انتظار کر رہی تھیں، پیروں کی چاپ سن کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سلام کر کے میں آگے بڑھا اور ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرے سر کو ٹٹول کر انھوں نے دونوں ہاتھوں سے پکڑا، پیشانی اور رخسار کے بوسے لیے اور لپٹا لیا۔ اور

اے گل بہ تو خورسندم تو بوئے کسے داری

کہہ کر زار و قطار رونے لگیں۔ خالدہ نے بھی ان کا ساتھ دیا، جو قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔ اس کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔

فخری کی ماں کا سن ساٹھ سے کچھ اوپر رہا ہوگا۔ ان کے سر کے کھچڑی بال سیاہ رومال سے ڈھکے تھے اور جسم پر سیاہ رنگ کا ڈھیلا ڈھالا عربی وضع کا لباس تھا۔ ان کی بے نور آنکھیں بھی سیاہ شیشوں اور سیاہ فریم کی عینک سے چھپی تھیں۔ ان کے خدوخال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جوانی میں بڑی طرحدار اور شان دار خاتون رہی ہوں گی۔ کچھ دیر بعد جب رونے کا سلسلہ ختم ہوا تو مجھ سے معذرت کرتے ہوئے خالدہ کو چائے لانے کی ہدایت کی۔ فخری کا حال پوچھتی اور کرید کرید کر ان ہی کی باتیں کرتی رہیں۔ باتیں کرتے ہوئے اضطراری طور پر میرے جسم پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ فارسی بڑے فراٹے سے بولتیں، لیکن ان کا لہجہ غیر ایرانی بلکہ بڑی حد تک ہندستانی تھا۔ میری ٹوٹی پھوٹی فارسی دانی اس وقت بہت کام آئی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد جب میں نے اجازت چاہی، تو ماں بیٹی نے کھانے کے لیے روکا۔ میں نے بہت سے عذر تراشے مگر کسی کی پذیرائی نہ ہوئی۔

کسی عراقی گھر میں کھانا کھانے کا میرے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ کھانا لگایا تو گیا میز پر، لیکن ذائقے کے اعتبار سے ہندستانی مذاق سے قریب تر تھا۔ پلاؤ اور سیخ کباب کا مزہ تو یک سر ہندستانی تھا۔ تہران میں یہ دونوں چیزیں بارہا کھائی تھیں، لیکن ان کا ذائقہ

بالکل جداگانہ تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ عراقی زندگی کے اور شعبوں کی طرح وہاں کے کھانوں پر بھی ان کے ترکوں کے مذاق کی گہری چھاپ ابھی باقی ہے، جو اس صدی کی دوسری دہائی تک یہاں کے حکمراں رہے تھے۔ روٹی تو مزے ہی میں نہیں، شکل و صورت کے اعتبار سے بھی ہندستانی خمیری روٹی کی سی تھی۔

فخری کی ماں نے میری معلومات میں یہ دلچسپ اضافہ کیا کہ عراق میں روٹی بالعموم گھروں میں نہیں پکتی۔ بازاروں میں بڑے بڑے تنور ہوتے ہیں۔ جہاں روٹی لگوائی جاتی ہے۔ عام طور پر لوگ سات آٹھ دن کے لیے روٹی ایک ساتھ لگوا لیتے ہیں، جو بڑی بڑی احتیاط کے ساتھ رکھی جاتی ہے۔ کھانے کے وقت سے گھنٹہ بھر پہلے ضرورت کے مطابق روٹی نکال کر ایک نم کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہے۔ کھانے کے وقت جب نکالی جاتی ہے، تو بالکل نرم ہوتی ہے، اور ذائقے میں بھی کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

تین چار گھنٹے کی گفتگو کے دوران ماں بیٹی دونوں نے فخری کی بیوی صبیحہ کا نام تک نہ لیا۔ فخری کی قاہرہ کی زندگی کی باتیں کرتے ہوئے ان کی پریشانیوں کا جب میں نے ذکر شروع کیا تو ان کی ماں تاڑ گئیں کہ اب میں کیا کہنے والا ہوں۔

"یہ پریشانی تو فخری نے خود ہی جان بوجھ کر مول لی ہے" معمر خاتون نے جواب دیا "جب وہ قاہرہ جا رہے تھے تو اس وقت بھی ان کی خواہش تھی کہ میں صبیحہ کو اپنے ساتھ رکھ

لوں۔ لیکن میں یہ کیسے کرتی؟ میرے سامنے ایک یتیم غیر شادی شدہ بیٹی ہے۔ کون شادی کرے گا اس کے ساتھ اگر صبیحہ کو میں رکھ لوں اپنے پاس؟ یہیں ہی نہیں سارا بغداد جانتا ہے کہ وہ کون اور کیا ہے!"

یہ جواب سن کر میں سوچنے لگا کہ مشرق ہر جگہ مشرق ہی ہے۔ سماجی قوانین کی گرفت ہر جگہ یکساں ہی ہے، خواہ وہ مشرق بعید ہو یا مشرق قریب یا مشرق اوسط۔

بغداد میں نرائنن ہی سے پرانے دوستوں کا پتا چل سکتا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی عراق ٹائمز کے دفتر ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ کسی ضرورت سے وہ بصرے گئے تھے، آج ہی واپس آئے ہیں اور ان کی ڈیوٹی رات کی ہے۔ چناں چہ اعظمیہ سے لوٹتے ہوئے میں ان کے دفتر چلا گیا، جو راستے ہی میں تھا۔

"بڑے موقعے سے آئے ہو" صاحب سلامت کے بعد نرائنن نے کہا "کل حسین یہاں آ رہے ہیں۔ تین ہفتے کے لیے وہ ہندستان گئے تھے اور چند ہی روز ہوئے وہ لوٹے ہیں۔ اور راجن بھی دو تین ہفتے میں وطن جانے والے ہیں۔"

"حسین کے آنے کی تو تم نے اچھی خبر سنائی، ان سے ہندستان کے تازہ حالات معلوم ہو سکیں گے۔"

"راجن اور حسین کو میں نے کل رات کھانے پر بلایا ہے۔ میرے گھر میں آج کل بہت سے مہمان ہیں، اس لیے ان لوگوں کو

سمیرامس میں کھانا کھلانے کا ارادہ تھا، لیکن اب میرا خیال ہے کہ تمھارے یہاں زیادہ مناسب رہے گا۔ ہوٹل میں بے تکلفی سے باتیں نہ ہو سکیں گی۔"

بصرے سے آنے والی گاڑی دن کے دس بجے بغداد پہنچی تھی۔ حسین سے ملنے کے اشتیاق میں اسٹیشن میں بھی چلا گیا۔ راجن وہاں پہلے سے موجود تھے۔ پیچھے سے جاکر ان کی آنکھیں میں نے بند کرلیں۔ باوجود کوشش کے وہ سمجھ نہ سکے۔ ان کی آنکھوں پر سے میں نے ہاتھ ہٹایا تو

"ارے تم کہاں!" کہتے ہوئے لپٹ گئے "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ تم ہو سکتے ہو۔"

"کل سہ پہر ہی کو میں پہنچا ہوں یہاں۔"

"اس وقت حسین بھی بصرے سے آرہا ہے۔ اور آج رات کو نرائنن نے مجھے اور حسین کو سمیرامس میں رات کے کھانے پر بلایا ہے، تم بھی آجانا وہیں۔"

"نرائنن سے میں رات ہی ملا تھا۔ اب تو وہ دعوت سمیرامس میں نہیں، میرے یہاں ہے۔"

"یہ بہت اچھا ہوا۔ سمیرامس جاتے ہوئے، نہ جانے کیوں، مجھے ہمیشہ الجھن سی ہوتی ہے۔ اور تمھارے یہاں باتیں بھی آزادی سے ہو سکیں گی۔ حسین ابھی پچھلے ہی ہفتے ہندستان سے واپس آیا ہے۔ ہندستان کے دو مہینوں کے قیام نے اس کی

ذہنی صحت بہت کچھ سدھار دی ہے۔"

یہ باتیں ہم کر ہی رہے تھے کہ گاڑی آگئی۔ راجن تو ان سے بصرے ہی میں مل چکے تھے، اس لیے حسین پہلے میری ہی طرف بڑھے۔ اور بغل گیر ہوتے ہی میری موجودگی پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"راجن یا نرائن نے بصرے میں مجھے نہیں بتایا تھا کہ تم بغداد واپس آگئے ہو۔"

"کل ہی میں یہاں پہنچا ہوں — بس تمھارا استقبال کرنے اور تم سے پوچھنے کہ:

"وطن سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن!"

"کچھ نہ پوچھو یارانِ وطن کا حال! شاید خود انھیں بھی اپنا حال معلوم نہیں ہے۔ میں تو ہندستان جاکر کھو سا گیا ہوں۔ کل ہی مجھے واپس جانا ہے، آج ہی رات کو ملاقات ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"اس کا اہتمام نرائنن نے آج ان ہی کے یہاں کیا ہے" راجن نے حسین کو بتایا۔

"یہ تو بہت اچھا ہے" حسین نے خوش ہو کر کہا "آج کی رات کو ہم جاوداں کرلیں گے۔ پھر نہ جانے کب ملاقات ہو۔"

رات کی صحبت میں اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے حسین سے سوال کیا:

"اے ہمدم دیرینہ! کیسا ہے جہان رنگ و بو؟"

"اس کا تو وہی جواب ہے" حسین نے پژمردہ لہجے میں کہا "جو شیطان کے اس سوال پر جبرئیل نے جواب دیا تھا:

"درد و داغ و سوز و ساز و آرزو"

"پچھلی بار جب ہم اسی جگہ مل بیٹھے تھے" نرائنن نے براہ راست اصل موضوع کو چھیڑا "تو اس وقت شملہ کانفرنس ہونے والی تھی۔ آج جب ہم یہاں جمع ہو رہے ہیں، تو عن قریب برطانیہ کا وزارتی مشن ہندستان جانے والا ہے جو ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرے گا، جنھیں سلجھانے میں شملہ کانفرنس ناکام رہی تھی۔"

"اس موضوع پر گفتگو شروع کرنے سے پہلے" راجن نے تجویز پیش کی "آؤ ہم سب وزارتی مشن کی کامیابی کے لیے دعا کریں۔"

"دعا سے کچھ نہیں ہوتا" حسین نے کہا۔

"آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

"مجھے تو ڈر ہے کہ اس مشن کا بھی وہی حشر ہوگا، جو شملہ کانفرنس کا ہوا تھا۔"

"میں اس درجہ مایوس نہیں ہوں" نرائنن نے کہا "اور اگر وہی ہوا جو حسین نے کہا ہے، تو ملک میں ایک خوں ریز انقلاب ہوگا اور جو کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کو بہالے جائے گا۔"

"پچھلی صحبت میں میں نے کہا تھا کہ شملہ کانفرنس اگر ناکام

ہوئی تو اس کی ذمے داری برطانوی سامراج پر نہیں، ہمارے لیڈروں پر ہوگی ـــــ خواہ وہ کانگریس کے ہوں یا مسلم لیگ کے۔ ہندستان جاکر مجھے معلوم ہوا کہ شملہ کانفرنس حقیقتاً مسٹر جناح کی ضد کی چٹان سے ٹکراکر پاش پاش ہوئی، اور اس سے ملک کے مفاد سے زیادہ مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچا۔ اور"

"معاف کرنا" راجن نے حسین کو ٹوکتے ہوئے کہا "ملک کا مفاد اور مسلمانوں کا مفاد دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں۔"

"بحث نہ چھیڑو" نرائنن نے راجن سے کہا "حسین کو پوری بات کہہ لینے دو۔ بعد میں سوالات پوچھنے کا ہمارا حق محفوظ رہے گا۔"

"حقیقت یہ ہے" حسین نے شروع کیا "شملہ کانفرنس کی ناکامی ہی نے میرے سوچنے کا ڈھنگ بدل دیا تھا۔ مسٹر جناح نے اس کانفرنس میں جو بے لوچ اور غیر منطقی رویہ اختیار کیا تھا، وہ مجھے نامناسب ہی نہیں، بلکہ غلط معلوم ہوا تھا۔"

"لیکن تم نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا" راجن نے پھر ٹوکا۔ "اور تم تو مسٹر جناح کی وکالت ہی کرتے رہے تھے۔ یاد ہے نا؟"

"ہاں یہ سچ ہے کہ میں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا" حسین نے اعتراف کیا "اس میں کچھ تو میری کم زوری کو دخل تھا، اور کچھ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ ہندستان سے اتنی دور بیٹھ کر

حالات کا صحیح اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اپنے انداز فکر کی تبدیلی پر اس وقت خود مجھے بھی بھروسہ نہ تھا۔ چنان چہ اپنے معتقدات کے قلعے کے منہدم ہونے کا اعلان کرنا میرے نزدیک قبل از وقت تھا۔"

"مسلم لیگ اور مسٹر جناح کی جب تم وکالت کرتے تھے تو اس وقت بھی تم جذباتی ہوتے تھے" راجن نے پھر حسین کی ٹانگ کھینچی "اور آج جب تم ان دونوں کی مخالفت کر رہے ہو تو بھی تم جذباتی ہی ہو۔"

"ایمان دار آدمی بالعموم جذباتی ہوتے ہیں" نرائنن نے بیچ بچاؤ کیا "میں نے ہمیشہ حسین کو ایمان دار سمجھا ہے۔"

"بہرحال ہر ایمان دار آدمی جذباتی ہوتا ہے یا نہیں" میں نے کہا "میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا، لیکن تم نے اب تک کوئی کام کی بات نہیں بتلائی ہے۔"

"اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے" حسین نے میری بات کا جواب دیا "کہ میں تمھارا ہم خیال ہو گیا ہوں۔"

"اس پر تو ہم سب متفق ہیں" راجن نے کہا "جناح کو اس پر نہیں اڑنا چاہیے تھا کہ کانگرس کو کسی مسلمان کو اپنی فہرست میں جگہ دینے کا حق نہیں ہے۔ لیکن جب کانفرنس اسی بات پر ختم ہو رہی تھی تو کانگرس کو یہ تجویز ضرور پیش کرنی تھی کہ مسلم لیگ گورنمنٹ بنا لے، اور کانگرس کے کسی آدمی کے علاوہ جسے چاہے وہ اپنی حکومت میں شامل کر لے۔"

"اور کانگرس کو یہ وعدہ بھی کرنا چاہیے تھا" نرائنن نے اضافہ کیا "کہ حکومت سے باہر رہ کر بھی مسلم لیگ کی حکومت کی وہ مخالفت نہیں کرے گی۔"

"کانگرس اگر یہ تجویز پیش کرتی" حسین نے جواب دیا "تو زیادہ سے زیادہ اسے پروپگنڈائی پیش کش کا نام دیا جاتا، اور یہ تجویز تو بہت پہلے گاندھی جی بھی پیش کر چکے تھے، اور برطانوی حکومت نے اسے مانا نہیں تھا، اور اس وقت بھی وہ نہ مانتی۔ کسی بات کو فرض کر کے گفتگو کرنا بے معنی ہے۔ اس کانفرنس میں مسلم لیگ کی سب سے بڑی فتح تو یہ ہوئی تھی کہ کانگرس جو اب تک مسلم لیگ کو اپنا مدمقابل نہیں تسلیم کرتی تھی، وہ اس نے مان لیا تھا۔ تم لوگوں کو بھی شاید یاد ہو کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد جواہرلال نہرو نے ایک بیان میں کہا تھا کہ ہندستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں —— کانگرس اور انگریز۔ اس کے جواب میں مسٹر جناح نے کہا تھا کہ ایک تیسری پارٹی بھی ہے اور وہ ہیں مسلمان، یعنی مسلم لیگ۔ اس وقت کانگرس نے اس کو تسلیم نہیں کیا تھا، لیکن شملہ کانفرنس میں یہی تین پارٹیاں تھیں —— کانگرس، مسلم لیگ اور برطانیہ۔ چناں چہ طے یہی ہوا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے پانچ پانچ نمایندے ہوں گے، اور چار ناموں کا اضافہ برطانیہ کی طرف سے لارڈ ویول کریں گے۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ بڑی دل چسپ پوزیشن تھی۔ مسلم لیگ کے پانچ نمایندے یقیناً مسلمان ہوتے، کانگرس

کی فہرست میں بھی ایک مسلمان ضرور ہوتا، جس پر وہ اصرار کر رہی تھی، اور لارڈ ویول کی فہرست میں بھی ایک مسلمان نام تھا۔ اس طرح سے وائسرائے کی کونسل کے چودہ ممبروں میں سے سات ممبر مسلمان ہوتے۔ کانگرس کی فہرست میں ایک مسلمان کے علاوہ ایک عیسائی، ایک پارسی اور صرف دو اونچی ذات کے ہندو تھے۔ لارڈ ویول کی فہرست میں ایک مسلمان کے علاوہ ایک سکھ اور دو ہری جن تھے۔ اس طرح سے اکثریت مسلمانوں ہی کی ہوتی —— سات مسلمان، دو اونچی ذات کے ہندو، دو ہری جن، ایک پارسی اور ایک عیسائی۔ مگر مسٹر جناح اس بات کے لیے اپنے کو آمادہ نہ کر سکے کہ مسلم لیگ کے علاوہ کوئی اور بھی مسلمانوں کو اپنے نمایندے کے طور پر نام زد کرے۔ لیکن اس سارے قصے کا دل چسپ ترین پہلو یہ ہے کہ یہ حقیقت، جو میں نے بیان کی ہے، ہندستانی مسلمان اس سے بے خبر ہی نہیں ہے، بلکہ انھیں یقین دلایا گیا ہے کہ شملہ کانفرنس کی ناکامی میں سارا قصور کانگرس ہی کا ہے، اور اس نے اسلام کو اور زیادہ خطرے میں ڈال دیا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہندستان کی آزادی کو اب کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ملک میں ہر طرف سامراج دشمنی کی بارودی سرنگیں بچھی ہیں۔"

۲۰ مارچ کو برطانوی وزارتی مشن لندن سے روانہ ہوا، جو تین

ممبروں پر مشتمل تھا ــــ وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹیفرڈ کرپس اور مسٹر اے، وی، الکزینڈر۔ ان تینوں میں اہم ترین شخصیت کرپس کی تھی، جنھیں برطانوی لیبر پارٹی کا کامیاب ترین منصوبہ ساز سمجھا جاتا تھا۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ کسی اسکیم کو مرتب کرتے وقت ان کی نگاہ مسئلے کے بڑے سے بڑے پہلو ہی پر نہیں جزئیات پر بھی رہتی تھی چناں چہ وہی اس مشن کا بھی 'دماغ' تھے۔ ہندستانی لیڈروں سے ان کی خاصی واقفیت تھی اور جواہر لال نہرو سے تو ان کا یارانہ تھا۔

رات کو مشن نے بغداد کے برطانوی سفارت خانے میں قیام کیا، جو دجلہ کے کنارے بغداد کی سب سے زیادہ پر فضا عمارت ہے۔ دوسرے دن دس بجے صبح کو مشن کراچی کے لیے روانہ ہوا، تو کچھ مقامی اخبار نویس بھی ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ کرپس ہی نے چند منٹ تک اخباری نمایندوں سے بات چیت کی۔

"ہمیں آپ کی ذات سے بڑی امیدیں ہیں" نرائنن نے کرپس سے کہا "ہمیں یقین سا ہے کہ آپ ہمارے مسائل کا حل ڈھونڈنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔"

"مسائل کا حل ہمیں نہیں ڈھونڈھنا ہے" انھوں نے جواب دیا "یہ کام تو ہندستانی لیڈروں کو کرنا ہے، لیکن اس میں ہم ان کی مدد ضرور کریں گے۔ ہمارا کام تو ہندستانی لیڈروں کے نقطۂ نگاہ کو ایک دوسرے کے قریب لانا ہے۔"

"آپ سے زیادہ کون ہندستانی لیڈروں کے نقطۂ نگاہ سے

واقف ہے" نرائنن نے مزید سوال کیا "کانگرس اور مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ میں کیا واقعی قطبین کا فرق ہے ؟"

"بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے" انھوں نے جواب دیا "لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ ہندستان کی آزادی کے بنیادی سوال پر دونوں پارٹیاں متفق ہیں۔ اختلاف صرف فروعات میں ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ وہ ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھیں اور کسی متفقہ فیصلے پر پہنچیں۔"

"کیا آپ لوگوں کی حیثیت صرف ایمان دار ثالث یا دلال کی سی ہے" ایک عراقی اخبار نویس نے سوال کیا "جو دو فریقوں کے درمیان صرف واسطے ہی کا کام کرتا ہے ؟"

"ہاں بڑی حد تک ہماری حیثیت ایک ایمان دار دلال ہی کی سی ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"کسی منزل پر بھی آپ کیا ثالث بننا پسند نہ کریں گے ؟"

"ثالث بننے سے اپنے دامن کو ہم بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔"

فوجی سے شہری

بغداد میں دو ڈھائی ہفتے گزارنے کے بعد، ۲۸ مارچ کی رات کے بارہ بجے بغداد ائرپورٹ پہنچا تو اس ہلچل اور اضطراب کے آثار وہاں یک سر نظر آئے، جو جہاز کی روانگی کے وقت کی علامت ہے۔ لاونج میں بھی ہر طرف سناٹا نظر آیا۔ صرف ایک انگریز کرنل دروازے کے قریب ہی صوفے پر نیم خوابی کے عالم میں نیم دراز تھا۔ ایک بجے کے قریب برطانوی رائل ائرفورس کے عملے کے ایک فرد نے کرنل کو جگایا۔ پھر ہمارے سفر کے اجازت ناموں کا معائنہ کرنے کے بعد اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

لاونج سے نکل کر ہم رَن وے کی طرف بڑھے تو ایک پرشور جہاز بھی ہماری طرف بڑھتا نظر آیا۔ قریب پہنچ کر رکا تو معلوم ہوا کہ یہی ہمارا 'تخت سلیماں' ہے۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی جہاز نے دوڑ شروع کی، اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں معلق ہو گیا۔ یہ ساری منزلیں چند منٹ

میں طے ہوگئیں۔ جہاز کے اندرونی حصے کا ہم نے جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ کرسی یا اس قبیل کی کسی اور چیز کا وہاں کوئی وجود نہ تھا۔

"یہ کس قسم کا جہاز ہے؟" ایک باوردی کریو کے فوجی سلام کا جواب دیتے ہوئے کرنل نے ناگواری کے لہجے میں سوال کیا۔

"جناب یہ کوریئر پلین ہے" کریو نے ادب کے ساتھ جواب دیا۔

"اگر معلوم ہوتا کہ یہ کوریر پلین ہے" جہاز کو موٹی موٹی گالیاں دینے کے بعد کرنل نے کہا "اور مجھے بھی ڈاک کے تھیلوں کی طرح لدنا پڑے گا، تو اس سے سفر کرنا میں ہرگز گوارا نہ کرتا۔"

"اس جہاز میں تو خاص خاص حالتوں ہی میں سفر کی اجازت دی جاتی ہے" کریو نے مزید وضاحت کی "اس میں تو صرف فوجی ڈاک اور ڈپلومیٹک بیگ ہی جاتے ہیں۔ ایک کیبن میں کوریر اور کریو کے لیے چند کرسیاں ہیں، لیکن وہیں بیگ بھی رکھے جاتے ہیں، اور وہاں قدم رکھنے کی بھی کسی کو اجازت نہیں ہے۔"

"تمھارا کیا خیال ہے اس جہاز کے بارے میں؟" یکایک کرنل مجھ سے مخاطب ہوا۔

"میرا بھی وہی تاثر ہے کرنل، جو آپ کا ہے" میں نے محتاط

جواب دیا۔
"تمھیں معلوم تھا کہ یہ کوریر پلین ہے"۔
"ہاں کرنل" میں نے جواب دیا "مجھے یقیناً معلوم تھا کہ یہ کوریر پلین ہے، اور اس میں سفر کرنے کی اجازت بھی بڑی مشکل سے ملی، اس کی اندرونی ساخت کا حال اگرچہ مجھے بھی نہیں معلوم تھا، تاہم معلوم بھی ہوتا تو آج سفر کرنے کے موقعے کو میں ہاتھ سے جانے نہ دیتا، کیوں کہ اگلے آٹھ دس دن تک کسی سول پلین میں جگہ نہیں تھی"۔
"شادی کرنی ہے؟" کرنل نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا "یا قاہرہ میں کوئی محبوبہ انتظار کر رہی ہے؟"
"دونوں باتیں نہیں ہیں کرنل" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا "فوجی سے شہری بننا ہے"۔
جہاز میں ہم دونوں کے علاوہ چار پانچ انسانی روحیں اور تھیں، لیکن ان سب کا تعلق رائل ائرفورس کے عملے ہی سے تھا۔ ان ہی سے مانگ کر کرنل چار کمبل لے آیا۔ دو خود بچھائے اور دو میرے حوالے کیے۔ پھر کٹ بیگ سے روئی کا چھوٹا سا بنڈل نکالا۔ تھوڑی سی اپنے کانوں کے گھوگھوں میں بھری اور تھوڑی سی میری طرف بڑھا دی۔ میں نے بھی یہی کیا۔ پھر اس نے فلاسک کھولا، جس میں گرم گرم کافی تھی۔ خود پی اور مجھے بھی پلائی۔
یہ ڈیکوٹا جہاز تھا۔ کان میں روئی بھرنے کے باوجود اس کی آواز بڑی گوش ربا تھی۔ کرنل تو جلد ہی سو گیا، لیکن مجھے نیند نہ آئی۔ مگر

اپنی تمام خرابیوں کے باوجود جہاز نکلا خاصا صبا رفتار۔ میری توقع کے خلاف، صبح تڑکے ہی اس نے ہمیں قاہرہ جا اتارا۔ اس وقت شہر تک جانے کے لیے ائرپورٹ پر کوئی سواری نہ تھی، اس لیے وہیں لاونج میں اپنے اپنے سامان کو سروں اور پیروں کے نیچے رکھ کر صوفوں پر ہم دونوں دراز ہو گئے۔

آٹھ بجے کے قریب آنکھ کھلی تو کرنل کے خراٹوں نے سارے لاونج کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ سواری کی فکر میں باہر نکلا تو سامان سے لدا پھندا ایک فوجی ٹرک کھڑا نظر آیا، جو روانہ ہونے کے لیے پر تول ہی رہا تھا۔ میں نے لپک کر کرنل کو جگایا۔ جلدی جلدی اس نے اپنا سامان پیٹھ پر لادا، میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ہم دونوں ٹرک کے قریب پہنچے تو وہ جنبش میں آچکا تھا۔ کرنل نے فوجی لہجے میں ڈپٹ کر آواز لگائی، ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر جھانکا اور انجن بند کر دیا۔

"میں آپ کا بے حد ممنون ہوں" راستے میں کرنل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے کہا۔

"کیوں؟"

"پچھلے سات آٹھ گھنٹوں میں آپ نے جو نوازشیں کی ہیں، ان کے لیے۔"

"نان سنس، مجھے تمھارا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ تم اچھے ہم سفر ثابت ہوئے۔"

"ہم ہندستانیوں کو انگریزوں کا بہت تجربہ ہے" میں نے

کہا "مگر آپ ان چند انگریزوں میں ہیں، جنھیں غیر انگریز کہا جا سکتا ہے۔"

"ایک تو میں انگلستان کا نہیں، آئرلینڈ کا رہنے والا ہوں" کرنل نے جواب دیا "دوسرے یہ کہ ہندستان تو چھٹے ہوئے بدمعاش انگریز ہی بھیجے جاتے ہیں، ان پر انگریزی قوم کو قیاس کرنا ناانصافی ہے۔ پھر میں نے یہ بھی سنا ہے کہ ہندستان کی آب وہوا ان بدمعاش انگریزوں کی بدمعاشیوں کو اور بھی چمکا دیتی ہے۔ بلکہ اچھے اور شریف لوگ بھی وہاں جا کر بگڑ جاتے ہیں۔"

نو بجے کے قریب کیمپ پہنچا تو وہاں سب اپنے اپنے دفتر جا چکے تھے۔ سامان ایک طرف رکھا، نہا دھو کر چائے پی، اور باہر نکلنے سے پہلے چارپائی پر لیٹ کر صبح کا اخبار پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے آنکھ لگ گئی، اور پھر تو ایسا سویا کہ چار بجے کے بعد ہی آنکھ کھلی۔ چائے پی کر باہر جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ لفٹنٹ عنایت آ گئے، جو فیض احمد فیضؔ کے چھوٹے بھائی ہیں، اور میرے ہی محکمے سے متعلق تھے۔ ان سے میری ملاقات قاہرہ ہی میں ہوئی تھی۔ ادبی و سیاسی ذہنی ہم آہنگی نے ہم دونوں کو جلد ہی ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا۔

"آج شام کا پروگرام کیا ہے؟" عنایت نے سوال کیا۔

"میں تو فخری کے یہاں جانا چاہتا ہوں۔ تمھارا کیا پروگرام ہے؟"

"منگنی کی ایک تقریب میں شرکت کرنی ہے، تم بھی چلو۔"
"منگنی کس کی ہے؟"
"دفتر ہی کے سویلین کلرک یعقوب کی بہن کی منگنی ہے۔ تم چلوگے تو وہ اور بھی خوش ہوگا۔"

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ یعقوب عنایت کو لینے کے لیے آدھمکے صاحب سلامت کے بعد مجھے بھی اصرار کے ساتھ دعوت دی۔ مصری زندگی سے متعارف ہونے کے اس موقعے کو ہاتھ سے جانے دینا میں نے مناسب نہ سمجھا اور دعوت قبول کرلی۔

قاہرہ کی فلک بوس عمارتوں اور چوڑی چوڑی صاف ستھری سڑکوں سے گزر کر ہماری گاڑی جب شہر کے اس حصے میں پہنچی جہاں متوسط اور نچلے طبقے کے مصری رہتے ہیں، تو محسوس ہوا کہ مغرب سے نکل کر مشرق میں، یا یوں کہیے کہ نئی دلّی سے چل کر پرانی دلّی کے اندرونی علاقے میں جا پہنچے ہیں۔ یہاں بھی وہی بوسیدگی وکثافت اور گندگی وغلاظت تھی، جو مشرق کے کسی بھی بڑے شہر کے پس ماندہ علاقے میں ملتی ہے۔ یعقوب ہمیں اوپر کی منزل میں لے گئے جہاں پچیس تیس متوسط الحال مصری بیٹھے تھے۔ ان میں کچھ مستورات بھی تھیں۔ سب نے ہمیں اس طرح "اہلاً وسہلاً" (خوش آمدید) کہا، گویا ہمارا ہی انتظار رہا ہو۔ کچھ تاخیر سے پہنچنے کی ہم نے معذرت کی تو سب نے "مَارِشس، مَارِشس" (کوئی مضایقہ نہیں) کہہ کر ہمارے عذر کی پذیرائی کی۔ بیٹھتے ہی میزبانوں نے قہوہ سے، جسے مصری 'اَہوہ' کہتے ہیں، ہمارے

تلخیٔ کام ودہن کی آزمائش کی۔ یہ بے حد گاڑھا، جشی کے رنگ سے زیادہ سیاہ، اور شیر وشکر دونوں سے یک سر ناآشنا تھا۔ اس مجمع میں کم ہی لوگ انگریزی بول سکتے تھے۔ اور انگریزی بولنے والی خاتون تو ایک ہی نکلیں، جو زیادہ سن کی تو نہیں، لیکن موٹی اور بھدی سی تھیں۔

"انتا مسلم (تم مسلمان ہو؟)" کسی نے سوال کیا۔

"نعم" میں نے جواب دیا۔

پھر انھوں نے یہی سوال عنایت سے بھی دہرایا، اور انھوں نے بھی اثبات میں جواب دیا۔

"الحمد اللہ کل مسلمون ہنا (خدا کا شکر ہے کہ یہاں سب مسلمان ہی ہیں)" ہم دونوں کے جواب سن کر انھوں نے مسرت کے ساتھ اعلان کیا۔

پھر کچھ لوگوں نے اور بھی سوالات کیے، جو ہم دونوں کی عربی دانی کے احاطے سے باہر تھے۔

"قرآن پڑھ سکتے ہو؟" — انگریزی داں خاتون نے سب کی ترجمانی کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں پڑھ سکتا ہوں۔"

"تو عربی کیوں نہیں بول پاتے؟"

"قرآن تو پڑھا ہے، لیکن عربی نہیں پڑھی ہے۔"

"اگیب (عجیب)" خاتون نے میرے جواب پر حیرت کا اظہار کیا۔

"قرآن کی کوئی سورۃ یاد ہو تو سناؤ" ایک انگریزی داں مرد نے

کسی کے سوال کا ترجمہ کیا۔
"الحمد اللہ رب العالمین ۔۔۔" پوری سورۃ فاتحہ میں نے سنادی۔
"اگیب ادی (کتنی عجیب بات ہے)" کئی آدمیوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔

اس کے بعد صاحب خانہ نے کچھ عربی میں کہا اور اس کے ساتھ ہی سب اٹھ کھڑے ہوئے، ہم نے بھی سب کی تقلید کی۔ اب یہ مجمع ایک بڑے کمرے کی طرف بڑھا، جہاں چاروں طرف دیوار کے کنارے کنارے کرسیوں کی قطاریں لگی تھیں۔ کمرے کے وسط میں دیوار ہی سے لگا ہوا ایک تخت تھا، جس پر سرخ کپڑا بچھا تھا، اور اس پر دو صوفہ نما کرسیاں منگنی کے جوڑے کے لیے رکھی تھیں۔ کمرے کے درمیانی حصے میں ایک میلی سی دری بچھی تھی۔ خانہ کعبہ کی ایک بڑی سی تصویر اور چند عربی طغرے بھی کمرے میں آویزاں تھے۔

سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ لیے تو وہ جوڑا بھی کمرے میں داخل ہوا جس کی منگنی کی یہ تقریب تھی۔ کچھ لوگوں نے "اہلاً وسہلاً" اور "مرحبا" کے نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ ہم دونوں ایک طرف کونے میں بیٹھ گئے تھے، لیکن میزبانوں نے زبردستی وہاں سے اٹھا کر ہونے والے دولہا دلہن کی بغل میں ہمیں لا بٹھایا۔

ادھیڑ عمر کے ایک کلین شیو مصری نے، جو اپنے لباس وضع سے سند یافتہ عالم معلوم ہوتا تھا، عربی میں تقریر کی جو ہم سمجھ نہیں سکے۔ پھر ایک صاحب نے نظم سنائی، جو شاید اسی موقعے کے لیے کہی گئی تھی، اور جس کی حاضرین نے جی کھول کر داد دی۔ ابھی مجمع اس نظم سے لطف لے

ہی رہا تھا کہ چھم چھم کرتی اور تھرکتی ہوئی ایک جوان قبول صورت رقاصہ نے کمرے میں داخل ہو کر مجمع پر ہیجانی کیفیت طاری کر دی۔ اس کے سینے پر ہم رنگ باریک کپڑے کی چار پانچ انگل چوڑی ایک پٹی تھی، جس کے کنارے کنارے چھوٹے چھوٹے گھنگھرو ٹکے تھے۔ اسے مشکل سے ہی انگیا کا نام دیا جا سکتا تھا، جس کے اندر سے اس کی گداز چھاتیاں اسی طرح جھانک رہی تھیں، جیسے شراب شیشے سے باہر آنے کے لیے بے تاب ہو، اور رقص کے دوران تو یہ شراب، بڑی حد تک شیشے کے باہر آ ہی گئی۔ جسم کے نچلے حصے کی ستر پوشی ایک پتلی سی لنگوٹ کر رہی تھی، جو "انگیا" سے مختلف نہ تھی۔ اور باقی جسم ــــ از فرق تا بہ قدم ــــ بار لباس سے یک سر آزاد تھا۔ اس مجمع میں بوڑھے، جوان اور بچے ــــ عورتیں اور مرد سب ہی تھے، اور یہ سب اس نظارے سے یک ساں لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بعض لوگوں کے ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی تسبیحیں بھی تھیں، جو اکثر مصری عادتاً اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں، اور ہمہ وقت ان کی انگلیاں اس کے دانوں سے کھیلا کرتی ہیں۔ اس وقت رقاصہ کے جسم کی گردش جوں جوں تیز ہوتی، اسی مناسبت سے تسبیح کے دانوں پر ان کی انگلیوں کی رفتار بھی تیز ہو جاتی۔ یہ رقاصہ غالباً کسی مقامی کیبرے سے لائی گئی تھی، جس کے رقص میں اگر کوئی آرٹ تھا تو صرف جسم نمائی کا، اور اس نے حاضرین پر وجد و سماع کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ ہم دونوں کو رقص یا رقاصہ نے تو نہیں، لیکن 'تماش بینوں' کی کیفیت نے ضرور مبہوت کر رکھا تھا۔

رقص شروع ہوتے ہی لوگوں نے رقاصہ کو انعام سے نوازنا شروع کیا۔ اس کی شکل عجیب تر تھی۔ انعام دینے والا نوٹ کو ہاتھ میں لے کر اس طرح ہلاتا، جیسے کوئی شکاری شکرے کو بوٹی دکھا رہا ہو۔ نوٹ کو دیکھتے ہی وہ آفت جاں مٹکتی چمکتی نوٹ دکھانے والے کی طرف بڑھتی اور قریب پہنچ کر یا تو اس پر لیٹ جاتی یا کم از کم اس کے گلے میں بانہیں ضرور ڈال دیتی۔ اور انعام دینے والا بڑی بے تکلفی اور اطمینان سے اس کی انگیا یا لنگوٹ میں نوٹ اسی طرح ٹھونس دیتا کہ اس کی انگلیاں رقاصہ کے جوان جسم کے لمس سے کم از کم لذت آشنا تو ہو ہی جاتیں۔ اس عمل کے دوران انعام دینے والے کا ہاتھ اگر زیادہ بے راہ رو ہو جاتا تو اسے رقاصہ ایک عجیب انداز سے گھورتی اور کبھی کبھی دشنام طرازی پر بھی اتر آتی جسے سن کر پورا کمرہ قہقہوں کی آواز سے گونج اٹھتا، اور گالیاں کھانے والا دوسروں کو اس طرح آنکھوں آنکھوں میں دیکھتا، جیسے کہہ رہا ہو:

اے ہم نفس! نزاکت آواز دیکھنا

ہمارے یہاں دیہاتوں میں بیٹرنوں اور ادنا درجے کی طوائفوں کے ناچ میں اس سے ملتے جلتے منظر کبھی کبھی دیکھنے میں آتے ہیں، لیکن یہاں نہ تو ناچنے والی قید لباس سے اس درجہ آزاد ہوتی ہے، اور نہ تماش بین ہی اتنے من چلے۔ جب ہم نے دیکھا کہ ہر شخص رقاصہ کو انعام و اکرام سے نواز رہا ہے، تو ہمیں بھی ان کی پیروی ضروری معلوم ہوئی۔ مگر اوروں کے برعکس،

رقاصہ کے قریب آتے ہی، ہم نے نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیے، جسے اپنی گرفت میں لے کر اس نے تعظیماً سر کو ہلکی سی جنبش بھی دی۔ یہ اس نے اوروں کے ساتھ نہیں کیا تھا۔

رقص ختم ہونے کے بعد یہ محفل بھی برخاست ہوئی۔ پہلے منگنی کا جوڑا کمرے سے نکلا اور اس کے پیچھے پیچھے مہمانوں کا جلوس نکلا۔ اب اس مجمع نے ایک دوسرے کمرے کا رخ کیا، جہاں کرسیوں کے علاوہ کچھ تخت بھی تھے، جن پر قالین بچھے تھے۔ یہاں شربت سے مہمانوں کی مدارات کی گئی۔ اس کے بعد حقے لائے گئے، جن کے پیندے شیشے کے اور چلمیں بھی چھوٹی چھوٹی ایک خاص وضع کی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی حشیش کا دور چلنے لگا۔ اور ہم دونوں تک جب اس کا دور آیا تو ہم نے معذرت کی۔ لیکن پورا مجمع ہمارے پیچھے پڑ گیا۔ اس کے باوجود، جب کسی طرح بھی ہم انھیں ممنون کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو من چلے نوجوانوں نے اس خاتون کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا، جس کے اعزاز میں یہ تقریب برپا ہوئی تھی اور ہم سے کہا گیا کہ اگر ایک دو کش بھی ہم نے نہ لیے تو یہ بدشگونی سمجھی جائے گی۔

انڈین یونین

قاہرہ واپس لوٹنے کے دوسرے ہی دن، یکم اپریل ۱۹۴۶ء کو، انڈین آرمی پبلک ریلیشنز سے دامن جھٹک کر میں عرب لیگ سے وابستہ ہو گیا۔ عراق، ایران اور مصر کے ایک سال کے قیام میں نہ تو پاسپورٹ کی ضرورت پیش آئی تھی اور نہ ویزے کی حاجت۔ فوجی وردی ہی اس وقت تک پاسپورٹ اور ویزے کا کام دے رہی تھی، لیکن قیام کی نوعیت بدلتے اور فوجی وردی اترتے ہی یہ دونوں چیزیں مصر میں قیام کی اولین شرطیں قرار پائیں۔ آرمی ہیڈ کوارٹر کی وساطت سے پاسپورٹ کی منزل برطانوی سفارت خانے نے آسان کی اور عرب لیگ کی وساطت سے مصری وزارت داخلہ سے ویزا مل گیا۔ ان دونوں منزلوں کے طے ہونے میں پندرہ بیس دن لگے۔ لیکن فوجی سے شہری بننے کی دوسری ضابطے کی کارروائیوں میں کوئی ایک مہینہ لگ گیا۔ یہ زمانہ میں نے جزیرہ کیمپ ہی میں گزارا اور ان تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھاتا رہا،

جواب تک مجھے حاصل رہی تھیں۔ ذاتی تعلقات کی بنا پر کینٹین سے فائدہ اٹھانے کے مواقع تو اس وقت تک مجھے حاصل رہے، جب تک کہ آخری ہندستانی فوجی یونٹ مصر میں رہا۔

فوجی سے شہری بننے کے ساتھ ہی جن مسائل سے میں دوچار ہوا، ان میں ایک 'شہری لباس' کا مسئلہ بھی تھا، جو سرے سے میرے پاس تھے ہی نہیں۔ یہ مسئلہ ایک ہندستانی بزرگ ڈاکٹر ولی خاں کی وساطت سے حل ہوا۔ وہ مجھے درزی خانے کی ایک بڑی سی دوکان میں لے گئے، جس کے مالک ایک ہندستانی معراج دین تھے جو بڑی محبت اور خلوص سے ملے۔ انھوں نے دوسرے ہی دن ایک سوٹ سلوا کر دے دیا، اور پانچ سات دن میں روزمرہ کے استعمال کے تین اور سوٹ بنوا دیے، پھر اگلے ہفتے میں اتنے ہی اور سوٹ تیار کرا دیے۔ سب سے بڑا احسان انھوں نے یہ کیا کہ قیمت یک مشت نہیں، بالاقساط لی۔

مصر میں ہندستانی شہری بہت کم تھے۔ سکھ تو سرے سے تھے ہی نہیں، جن کی ایران میں بہتات تھی۔ یہاں اُن کی جگہ سندھیوں نے لی تھی۔ قاہرہ میں جو ہندستانی تھے بھی ان میں اور ہندستانی فوجیوں میں کوئی رابطہ نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے قیام کے ابتدائی دور میں ڈاکٹر ولی خاں ہی سے میری ملاقات ہو سکی، جو اپنے مختصر خاندان کے ساتھ ہمارے کیمپ کے قریب ہی ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ اکثر ہندستانی فوجی، بلا امتیاز مذہب، ان کے گھر جاتے تھے اور ان سے عقیدت و محبت رکھتے تھے۔

ڈاکٹر ولی خاں انگریز دشمن اور کٹر قوم پرست تھے۔ صوبہ سرحد کے کسی متمول گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی تھی، جہاں مولانا محمد علی مرحوم کے ہم جماعت تھے۔ میرے ایک قریبی بزرگ سے بھی ان کی گہری واقفیت نکلی، جو علی گڑھ میں ان کے ہم عصر تھے۔ اسی تعلق کی بنا پر میرے ساتھ بزرگانہ شفقت فرمانے لگے۔

ولی خاں نے خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں میں حصہ لیا تھا۔ تحریک خلافت ہی کے جلو میں علما نے جب ہجرت کا فتوا دیا اور

قندھار چلو، قندھار چلو دریائے اٹک کے پار چلو

کے نعروں سے ملک کی فضا گونجنے لگی تو ولی خاں بھی ترک وطن کر کے افغانستان چلے گئے، اور پھر کبھی ہندستان نہیں لوٹے۔ تحریک کی ناکامی کے بعد وہ ترکی گئے اور وہیں سے یورپ کی طرف نکل گئے۔ ۲۳-۱۹۲۲ء میں وہ یورپ پہنچ چکے تھے۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے ہوم ڈپارٹمنٹ کی فائلوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان برسوں میں انھوں نے "کریسنٹ" کے نام سے ایک ہفتہ وار یا پندرہ روزہ اخبار بھی نکالا تھا، جس کا ایک شمارہ بھی ان ہی فائلوں میں محفوظ ہے۔

یورپ کے دوران قیام میں ولی خاں نے سیاست کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام کی خدمت انجام دینے کی بھی کوشش کی۔ ان کی تبلیغی سرگرمیوں کے سلسلے میں مولانا محمد علی مرحوم کا ایک جملہ قابل ذکر ہے، جو میرے ہندستان لوٹنے کے بعد ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری نے سنایا۔ مولانا محمد علی علاج کے لیے جب فرانس گئے تو شوکت اللہ اُن

دنوں پیرس میں زیر تعلیم تھے۔ ایک دن مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ولی خاں بھی وہاں موجود تھے۔ ان کا تعارف کراتے ہوئے مولانا محمد علی نے کہا: "حسن نظامی کی طرح یہ بھی مبلّغ ہیں۔ حسن نظامی کی تبلیغ کا مادہ 'مبلّغ' اور ان کی تبلیغ کا 'بلوغ' ہے۔"

مولانا محمد علی مرحوم کا یہ بیان حسن نظامی کے باب میں صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن ولی خاں پر صادق آتا تھا۔ ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا منتہائے کمال یہ تھا کہ ایک حسین و جمیل جرمن خاتون کو مشرف بہ اسلام کر کے انھوں نے اپنی زوجیت میں لے لیا تھا، جو ان کے بیان کے مطابق جرمنی کے سابق شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ خاتون کی گفتگو اور نشست و برخاست کے انداز، شکل و صورت اور عادات و اطوار سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ شاہی خاندان سے اگر نہیں تو کسی اعلا خاندان سے ان کا یقیناً تعلق ہے۔

یورپ ہی میں ولی خاں کی ملاقات عزام پاشا سے ہوئی جو ان سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ جرمن زبان میں قرآن کے ترجمے کے لیے انھیں قاہرہ لے آئے۔ یہ کام تو کسی وجہ سے نہ ہو سکا، لیکن ولی خاں قاہرہ ہی کے ہو رہے۔ ان کی عمر ۴۶-۱۹۴۵ء میں، ساٹھ پینسٹھ کی اور بیوی کی چالیس پینتالیس کی رہی ہوگی۔ پانچ چھ سال کا ایک بچہ تھا اور ایک سترہ اٹھارہ سال کی جوان لڑکی جمیلہ، جو اسم بامسمیٰ تھی، فواد یونیورسٹی میں جرنلزم کی تربیت حاصل کر رہی تھی۔

معراج دین کے یہاں میں دوسری بار گیا، تو وہ دیر تک ہندستان کی سیاسی صورت حال پر باتیں کرتے رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب

دکھنی افریقہ کے ہندستانیوں کا مسئلہ نازک صورت اختیار کرتا جارہا تھا۔ ہندستان کی برطانوی حکومت نے بھی ہندستانی اجنٹ جنرل کو واپس بلالیا تھا۔ معراج دین نے اس سلسلے میں بھی اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔

"یہاں ہندستانیوں کی کوئی انجمن نہیں ہے؟" میں نے اسی گفتگو کے دوران سوال کیا۔

"ہے تو" معراج دین نے جواب دیا۔ پھر کچھ رک کر کہا "مگر بالکل بے جان ہے۔"

"آپ اس میں جان ڈالنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

"میرے پاس نہ وقت ہے اور نہ اتنی قابلیت۔ اگر آپ کچھ کریں تو ہر ممکن مدد کرنے اور آپ کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

"مگر میں تو یہاں نووارد ہوں۔ آپ کے اور ولی خاں کے علاوہ کسی ہندستانی سے بھی واقف نہیں ہوں۔"

"آپ ڈوہوٹل سے ملیے۔ ان کی دکان شیپرڈس کے سامنے ہے۔ وہی اس وقت یونین کے پریسیڈنٹ ہیں۔"

معراج دین کے یہاں سے اٹھ کر میں سیدھا دوہوٹل کی طرف چلا گیا۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد یونین کی ممبری کا فارم میں نے مانگا تو انھوں نے کہا کہ یونین تو برائے نام ہی ہے، اور اب اسے ختم کردینا ہی مناسب ہے۔ دکنی افریقہ کے سلسلے میں یونین کا جلسہ بلانے کی تجویز میں نے پیش کی تو وہ مجھ ہی سے اکھڑ گئے۔

"ہم کاروباری لوگ ہیں۔ سیاست سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے" انھوں نے جواب دیا "یہاں ہمارا قیام اور ہمارا کاروبار برطانوی سفارت خانے کے رحم و کرم پر ہے۔ سیاست میں ہم نے ٹانگ اڑائی تو ہمارا پاسپورٹ، ہی منسوخ کر دیا جائے گا، اور یہ انڈین یونین تو اس طرح کے کاموں کے لیے بنائی بھی نہیں گئی تھی۔"

اس ہمت شکن گفتگو کے پندرہ بیس دن بعد دن کا کھانا کھا کر کانٹی نینٹل ہوٹل سے نکل ہی رہا تھا کہ میدان محمد علی پاشا کی طرف سے ولی خاں آتے نظر آئے۔

"اس وقت آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"انڈین یونین کی میٹنگ میں" انھوں نے جواب دیا "آؤ تم بھی چلو۔"

"معراج دین نے مجھے بتایا تھا، مگر میں بالکل بھول گیا تھا لیکن میں تو ممبر بھی نہیں ہوں۔"

"تم چلو تو میرے ساتھ" ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے انھوں نے کہا "ممبر بننے میں کتنی دیر لگتی ہے۔"

"کہاں ہے جلسہ؟"

"یہاں سے بالکل قریب گینشی لال کے فلیٹ میں۔"

ہم دونوں پہنچے تو جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ ہو ل صدارت کر رہے تھے۔ حاضرین کی تعداد پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی پچھلے جلسے کی کارروائی پڑھی جا رہی تھی، جو سات آٹھ مہینے پہلے ہوا تھا۔

رپورٹ میں یونین سے ممبروں کی عدم دلچسپی کا رونا رو کر اسے ختم کر دینے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ رپورٹ ختم ہوئی تو صدر جلسہ نے حاضرین سے دریافت کیا کہ کسی کو کچھ کہنا تو نہیں ہے۔

"آپ اجازت دیں" میں نے کھڑے ہو کر کہا "تو مجھے کچھ کہنا ہے۔"

"آپ تو یونین کے ممبر ہیں نہیں" صدر نے اعتراض کیا "آپ کو کس نے بلایا تھا یہاں؟"

"ہم ان کو یہاں لائے ہیں" ولی خاں اور معراج دین نے ایک ساتھ کہا۔

"یونین کے ممبر اگر نہیں ہیں" کسی نے کھڑے ہو کر کہا "ہندستانی تو ہیں۔ بولنے دیجیے انھیں۔"

"آپ بولنا تو شروع کیجیے" ایک صاحب نے کہا جو میری بغل ہی میں بیٹھے تھے۔

"ہاں ہاں بولیے" کئی آدمیوں نے ایک ساتھ کہا۔

"اس سے پہلے کہ یہ بولنا شروع کریں" ولی خاں نے کھڑے ہو کر کہا "میں ان کا تعارف کرانا چاہوں گا۔"

اور اجازت ملنے سے پہلے ہی انھوں نے میرے بارے میں تقریر شروع کر دی، جو خاصی مبالغہ آمیز تھی۔ ان کے بعد میں نے مختصر سی تقریر کی، جس میں ہندستان کی موجودہ صورت حال کا اور دکنی افریقہ کے ہندستانیوں کے مسئلے کا ذکر کیا۔ آخر میں صدر اور ممبروں سے میں نے اپیل کی کہ یونین کو ختم کرنے کی جگہ پر اسے مضبوط کریں۔ حاضرین نے تالیاں بجا بجا کر میری تجویز کی تائید کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدر

نے انجمن ختم کرنے کی تجویز پیش نہیں کی۔

"آپ ہی یونین کے جنرل سکریٹری بن جایئے" ایک صاحب نے تجویز پیش کی، جو میری ہی بغل میں بیٹھے تھے۔

"میں تو ابھی ممبر بھی نہیں ہوں"

"لیجیے اس فارم کو بھر دیجیے" ایک فارم انھوں نے میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "ممبر بننے میں کتنی دیر لگتی ہے"

فارم بھرنے کے بعد میں نے ان ہی صاحب کے حوالے کر دیا۔ مجوز کی حیثیت سے جب انھوں نے اس پر دستخط کیے تو معلوم ہوا کہ ان کا نام کشن لال ہے۔ ایک دوسرے صاحب نے مؤید کی حیثیت سے دستخط کیے، جو کشن لال کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنا نام ریاض الدین فاروقی لکھا۔ اس کارروائی کے بعد میری ممبری کا فارم صدر کی میز تک پہنچ گیا۔ اور میں قاہرہ کی انڈین یونین کا باضابطہ ممبر بن گیا۔

میرے بعد خود صدر نے مختصر سی تقریر کی۔ میں ممبری کے فارم کی خانہ پری میں ایسا پھنسا کہ ان کی تقریر کا ابتدائی حصہ بالکل سن نہ سکا۔ آخر میں انھوں نے اپنی کاروباری مصروفیتوں کے پیش نظر یونین کے کاموں کی ذمہ داری لینے سے معذوری ظاہر کی۔ حاضرین نے ان کے عذر کو قبول کر لیا۔

اسی جلسے میں یونین کے مندرجہ ذیل نئے عہدے داروں کا انتخاب عمل میں آیا:

صدر   گنیشی لال

نائب صدر	ریاض الدین فاروقی
محمد علی
خازن	کشن لال
جنرل سکریٹری	عتیق صدیقی

گنیشی لال کی جنم بھومی آگرہ ہے۔ قاہرہ میں جواہرات کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کا نام برج لال ہے، گنیشی لال ان کی فرم کا نام ہے، اسی نام سے آگرہ اور جے پور میں ان کی بڑی بڑی دوکانیں ہیں لیکن قاہرہ میں وہ گنیشی لال ہی کے نام سے مشہور اور خاصے متعارف تھے۔

ریاض الدین فاروقی راجستھان کی چھوٹی سی ریاست قرولی کے رہنے والے تھے۔ قاہرہ میں ایک کھمباتی تاجر قادر بھائی کے ساتھ رہتے تھے۔ گنیشی لال سے بھی ان کے گہرے تعلقات تھے۔ قادر بھائی اور گنیشی لال کے کام میں بھی وہ ہاتھ بٹاتے تھے اور یہی دونوں ان کے کفیل تھے۔ سیاسی خیالات کے اعتبار سے کٹر نیشنلسٹ تھے۔ عربی خوب بولتے تھے۔

محمد علی پنجابی تھے۔ ان کے والد برطانوی فوج کے ساتھ درزی کا کام کرنے کے لیے قاہرہ آئے اور پھر یہیں رہ گئے۔ یہی کاروبار محمد علی کو اپنے باپ سے ورثے میں ملا۔ اب ان کی درزی کی دوکان نہیں، بلکہ بڑا سا کارخانہ تھا۔ برطانوی فوج کی وردیوں کی سلائی کا ان کے پاس ٹھیکہ تھا۔ انھوں نے مصر ہی میں شادی کی تھی بیوی اور بچے ہندستانی بولی سے یک سر نا آشنا تھے۔

انڈین یونین کے جلسے میں شرکت کے بعد میرے لیے قاہرہ میں دل چسپی کا ایک نیا مرکز پیدا ہوگیا۔ ہندستانی فوجوں کی مراجعت کے بعد، جن کا عمل بڑی حد تک مکمل ہو چکا تھا، میں قاہرہ میں حقیقی معنوں میں غریب الدیار بن گیا تھا۔ پرانے دوست رخصت ہو چکے تھے۔ ایک دو جو رہ بھی گئے تھے، وہ صبح و شام میں جانے والے تھے۔ اس نے میرے اندر غریب الوطنی کا احساس شدت سے پیدا کر دیا تھا۔ اسی سے میں نے روزانہ شام کو شپرڈس جانا شروع کر دیا تھا، جہاں کم از کم ان ہندستانیوں کی صورت ہی نظر آجاتی، جنھیں قاہرہ سے گزرتے ہوئے ایک دو دن وہاں ٹھہرنا پڑتا تھا۔ یہ لوگ بالعموم شپرڈس ہی میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ اسی مناسبت سے، ذہنی طور پر، میرے لیے شپرڈس قاہرہ اور ہندستان کے درمیان ایک پل سا بن گیا تھا۔ یہاں ہندستانیوں سے ملاقات ایک نعمت معلوم ہوتی تھی۔ انڈین یونین سے تعلق پیدا ہونے کے بعد تو شپرڈس شام کا مستقل اڈا بن گیا تھا کیوں کہ گنیشی لال، فاروقی اور کشن لال بھی شام کو وہیں آجاتے تھے۔

شام کو پانچ بجے سے چھ ساڑھے چھ بجے تک میں پابندی سے یونین کے دفتر میں بیٹھتا، جو میدان عطبہ میں جنرل پوسٹ آفس کے بالمقابل ایک چھ منزلہ عمارت کی تیسری منزل میں تھا۔ اس کی بغل ہی میں قاہرہ کی مشہور تفریح گاہ — ازبکیہ تھی۔ فاروقی اور کشن لال بھی اکثر شام کو وہیں آجاتے تھے، اور

پھر ہم سب ایک ساتھ شپرڈس جاتے۔

"کیا بجا ہے آپ کی گھڑی میں؟" ایک دن انڈین یونین کے دفتر سے نکل کر میں نے فاروقی صاحب سے سوال کیا۔

"میاں اپنی گھڑی کیوں نہیں دیکھتے؟" انھوں نے جواب دیا۔

"آپ بتا دیجیے گا تو کیا نقصان ہوگا؟"

"اسی میں ایک بار اسی جگہ اپنی ایک گھڑی سے ہاتھ دھو چکا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

اس کے جواب میں فاروقی صاحب نے جو قصہ بیان کیا، وہ خاصا دل چسپ تھا۔ ایک دن دوپہر کو یونین کے دفتر کی عمارت سے نکل کر مسکی بازار کی طرف وہ چلے ہی تھے کہ ایک مصری نوجوان نے انھیں روک کر سوال کیا۔

"ساء کم یا استاد (ساعۃ کم یا استاذ — جناب آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہے؟)"

"سامنے اتنا بڑا گھنٹہ گھر لگا ہے" فاروقی صاحب نے کچھ چڑھ کر جنرل پوسٹ آفس کے گھنٹہ گھر کی طرف اشارہ کر کے نوجوان کو جواب دیا "اس میں کیوں نہیں دیکھتے؟"

"معاف کیجیے" نوجوان نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا "میرے ہاتھ میں بھی زینتھ گھڑی بندھی ہے۔ اس میں اور پوسٹ آفس کی گھڑی میں دو منٹ کا فرق ہے۔ میں جاننا

چاہتا تھا کہ میری گھڑی غلط ہے یا یہ گھنٹہ غلط ہے۔"

یہ سن کر فاروقی صاحب نے معافی مانگی۔ اور جیب سے گھڑی نکال کر نوجوان کو وقت بتایا۔ شکریہ ادا کر کے وہ بھی ساتھ ہولیا۔ مسکی بازار تک دونوں ساتھ ساتھ آئے۔ یہ اپنے گھر کی طرف مڑے، اور نوجوان ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کر کے اپنی راہ چلا گیا۔

گھر پہنچ کر کچھ دیر بعد فاروقی صاحب نے کپڑے بدلنے کی نیت سے کوٹ اتارا اور واسکٹ کے بٹن کھولے تو پتہ چلا کہ گھڑی مع زنجیر کے ان کی جیب سے نکل چکی ہے۔

کچھ دنوں بعد اسی نوع کا ایک واقعہ میرے سامنے بھی پیش آیا۔ شہر کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانے کے لیے قاہرہ کے ایک مقامی اسٹیشن پر ریل کے انتظار میں بیٹھا تھا، جسے مصر میں میٹرو کہتے ہیں۔ فاروقی صاحب بھی ساتھ تھے۔ ہمارے قریب ہی ایک دوسری بنچ پر دو خوش پوش مصری بڑے انہماک سے مصری سیاست پر بحث کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک بہت موٹا اور دوسرا اسی قدر دُبلا تھا۔ گاڑی آئی تو ہم جس ڈبے میں داخل ہوئے اسی میں وہ دونوں بھی آگئے۔ یہاں بھی سرگرمی سے باتیں کرتے رہے۔ ڈبے میں دو مصری اور تھے۔ انھوں نے بھی ان کی باتوں میں دلچسپی لی۔ موٹا مصری باتیں کرتے کرتے سو گیا۔ اس کا ساتھی دو مصروں سے باتیں کرتا رہا۔ جب اس نے خراٹے لینے

شروع کیے تو اس کے ساتھی نے گھوم کر دیکھا، پھر اس کے شانوں کو ہلایا مگر اس سے بھی اس کی نیند ٹوٹی نہیں۔ دوسرے مصری بھی اس کی نیند کا مضحکہ اڑاتے رہے۔

"یہ میرا چچا زاد بھائی ہے" دبلے پتلے مصری نے اپنے رفیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور بچپن کا دوست بھی ہے۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے اس کی عادت ہے کہ ٹرین میں، بس میں یا ٹرام میں بیٹھا اور خراٹے لینے شروع کر دیے۔ میں ہمیشہ سمجھاتا ہوں مگر یہ کسی طرح اپنی یہ عادت نہیں چھوڑتا۔ آج میں اسے ایسا سبق دوں گا کہ جب گھر پہنچے گا تو بیوی اس کی بڑی خبر لے گی۔ پھر بعد میں اس کے گھر جا کر میں ہی صلح صفائی کراؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے چچا زاد بھائی کی جیب سے فاؤنٹین پن، بٹوہ اور گھڑی نکالی، اور اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو وہ اتر گیا۔

تھوڑی دیر بعد ٹکٹ چیکر آیا۔ ہمارے ٹکٹ دیکھنے کے بعد موٹے مصری کو بھی اس نے جگایا۔ بڑبڑا کر آنکھیں ملتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو بٹوہ غائب تھا۔ دوسری جیبیں بھی اس نے ٹٹولیں، اور جب وہاں بھی نہ ملا تو اس نے واویلا مچانا شروع کیا۔ کچھ دیر تو لوگ اس سے لطف لیتے رہے، لیکن جب اس کی حالت غیر ہونے لگی تو ایک مصری نے

اسے بتایا:

"گھبراؤ نہیں! تمھارا چچا زاد بھائی لے گیا ہے۔"

"بھائی؟" اس نے گھبرا کر سوال کیا "کون بھائی؟"

"وہی جو تمھارے ساتھ تھا۔"

"وہ میرا بھائی کہاں سے آیا! اس سے تو آج ہی پہلی مرتبہ میری ملاقات ہوئی تھی۔"

قاہرہ کی ایک شام

"انٹروڈکشن کلب کے نام سے ایک بزم بے تکلفی کی ہم نے داغ بیل ڈالی ہے" ایک دن عادل ثابت نے کہا "اگلے جلسے میں آپ بھی آئیے۔"

"دعوت کے لیے شکریہ، ضرور آؤں گا۔"

"تو پھر سنیچر کی شام کو آٹھ بجے آجائیے میرے گھر، اگر آپ چاہیں تو کسی اور کو بھی اپنے ساتھ لا سکتے ہیں۔"

عرب لیگ میں کام شروع کرنے کے تیسرے ہی دن عادل ثابت سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ لمبا سا قد، چھریرا بدن، سرخ وسپید رنگ، خوش رو اور خوش پوش نوجوان، صورتاً مصری نہیں ترک معلوم ہوتے تھے۔ انگریزی بہت اچھی بولتے تھے۔

"میرا نام عادل ثابت ہے" بے تکلفی سے اپنا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے کہا تھا "عزام پاشا سے آپ کا ذکر سننے کے بعد آپ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ دو بار آیا لیکن

آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں بھی اسی دفتر میں کام کرتا ہوں"۔
"مجھے واقعی افسوس ہے کہ آپ دو بار تشریف لائے اور میں نہ ملا۔ یہاں کس شعبے سے آپ کا تعلق ہے؟"
"تشریفات کے شعبے سے"
"یہ تشریفات کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔
"اسے انگریزی میں پروٹوکول کہتے ہیں" انھوں نے جواب دیا "میں رئیس التشریفات یا چیف آف پروٹوکول ہوں"
"بڑی خوشی ہوئی مل کر آپ سے۔" رخصت کرتے ہوئے میں نے عادل سے کہا۔
"شکریہ" انھوں نے جواب دیا "مجھے بھی آپ سے مل کر کچھ کم خوشی نہیں ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں اچھے دوست بن سکتے ہیں"
"عزام پاشا اور ان کے سکریٹری کے بعد آپ تیسرے مصری ہیں، جن سے میں اس دفتر میں ملا ہوں، مجھے بھی یقین ہے کہ ہم دونوں اچھے دوست بن سکتے ہیں"
یہ تھی میری اور عادل ثابت کی پہلی ملاقات۔ اس کے بعد تو ہم لوگ تقریباً روزانہ ملتے رہے، اور جلد ہی واقعی اچھے دوست بن گئے۔ پہلی ملاقات کے دو ڈھائی مہینے بعد انھوں نے انٹروڈکشن کلب میں شرکت کی دعوت دی۔
اس کلب کی نوعیت وغایت عادل ثابت کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ کچھ دوست، بلا تفریق جنس، مہینے کے پہلے سنیچر کی رات کو

نیل کی سطح پر مل بیٹھتے، گاتے بجاتے، خوش گپیاں کرتے، کھاتے پیتے:
کھاتے کم پیتے زیادہ، اور پھر علمی، ادبی، جنسی اور دنیا بھر کے مسائل
پر کبھی سنجیدہ اور کبھی غیر سنجیدہ انداز میں تبادلۂ خیالات کرتے۔ نئے نئے
ہم مشربوں کو خاص طور سے دعوت دی جاتی تاکہ تعلقات کا دائرہ
وسیع ہو۔

سنیچر کی رات کو مقررہ وقت پر عادل کے گھر پہنچا تو ایک ہندستانی
دوست قیوم اور ان کی بیوی سکندرہ بھی میرے ساتھ تھیں۔ قیوم دہلی
کے رہنے والے اور قاہرہ میں فری پریس جرنل (بمبئی) کے خصوصی
نمائندے تھے۔ میں نے عرب لیگ میں کام شروع کیا، تو اس کے
چند ہی ہفتے بعد قیوم بھی قاہرہ پہنچے۔ عزام پاشا سے ملنے کی فکر میں
ایک دن عرب لیگ کے دفتر آئے تو انھیں میرے پاس بھیج دیا گیا۔

پہلی ہی ملاقات کے بعد ایک دوسرے کے ذہن کا ہمیں بخوبی
اندازہ ہوگیا۔ ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا کہ قیوم اپنے لیگی رجحان پر
پردہ ڈالنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن ذہنی بُعد کے باوجود
ہم دوست بن گئے، اور یہ دوستی آخر وقت تک نبھتی بھی رہی،
جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں میں غیر محسوس طور پر، یہ معاہدہ
ہوگیا تھا کہ ہندستان کے سیاسی مسائل پر ہم بحث نہ کریں گے۔ قاہرہ
میں دو ڈھائی مہینے رہ کر قیوم شادی کرنے ہندستان گئے، اور
پندرہ بیس دن بعد جب وہ لوٹے تو ان کی بیوی سکندرہ بھی ان
کے ساتھ تھیں۔ یہ میجر عارف کی بہن تھیں، جو بغداد میں
انڈین آرمی پبلک ریلیشن ڈائرکٹریٹ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر، یا

اُس دفتر کے افسرِ اعلا تھے۔ بغداد میں ان کے ماتحت میں نے کام کیا تھا۔ اس تعلق کی بنا پر جلد ہی سکندرہ سے بھی میری بے تکلفی ہوگئی۔

ہم تینوں عادل کے گھر پہنچے تو بزم بے تکلف کے پندرہ بیس ممبر وہاں موجود تھے۔ کچھ تو جاننے والے ہی نکلے، اور کچھ سے تعارف ہوا۔ یہ قافلہ ٹیکسیوں اور موٹروں میں نیل کے کنارے پہنچا، تو چاند ان سر بہ فلک عمارتوں کی آڑ سے سر نکال رہا تھا، جن کا سلسلہ نیل کے کنارے کنارے دور تک چلا جاتا ہے۔ اس ابھرتے ہوئے چاند کو دیکھ کر مجاز کی نظم 'آوارہ' کا یہ بند، نہ جانے کیوں، بے اختیار یاد آگیا:

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مجھے یاد آیا کہ دو ڈھائی سال پہلے میں اور مجاز دہلی کی جامع مسجد کے علاقے سے گزر رہے تھے، تو چاند جگت سینما کے پیچھے سے آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجاز نے بتایا تھا کہ چھ سات سال قبل اسی جگہ اور اسی طرح چاند کو ابھرتے دیکھ کر یہ مصرعے بے ارادہ موزوں ہو گئے تھے۔ یہی باتیں کرتے ہوئے، ہم دونوں ایڈورڈ پارک میں چلے گئے۔ جسے دہلی کے کرخندار گھوڑا پارک کہتے ہیں۔ اس کے ایک ایسے گوشے میں

بیٹھ کر جہاں ہمیں کوئی نہ دیکھ سکے، ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے ہمارے سامنے شاہ جہاں کا سنگین قلعہ تھا، اور پشت پر اسی کی بنوائی ہوئی بلند و بالا جامع مسجد — اور اسی سے چند گز کے فاصلے پر سرمد شہید کا مزار، جس کی درویشانہ سادگی ان عمارتوں کے شاہانہ شکوہ کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اسی جگہ مجاز نے "ساغرِ مینا" کو سامنے رکھ کر اپنے مخصوص اندازِ گل افشانیٔ گفتار میں اس نظم کی شانِ نزول کے ساتھ ساتھ اس کی تلمیحوں اور کنایوں کی وضاحت بھی کی تھی۔

ان سب باتوں کے یاد آتے ہی اُس ابھرتے ہوئے چاند کو میں نے غور سے دیکھا، جو اجڑی ہوئی دلّی کے کسی بوسیدہ محل کی آڑ سے نہیں، بلکہ ترقی پذیر قاہرہ کی، آسمان سے سرگوشیاں کرنے والی جدید ترین عمارتوں کی اوٹ سے نکل رہا تھا۔ میں دیر تک سوچتا رہا کہ مجازؔ نے جس چاند کو دیکھ کر اتنی سوگوار نظم کہی تھی، وہ یقیناً اس سے مختلف رہا ہوگا۔ یہ چاند جو اس وقت میرے سامنے ہے، نہ تو کسی مُلّا کا میلا کچیلا عمامہ معلوم ہوتا ہے، اور نہ کسی بنیے کی پھٹی پرانی بہی۔ اسے نہ تو مفلس کی جوانی سے کوئی نسبت ہے اور نہ بیوہ کے شباب سے کوئی مناسبت۔ اس میں تو کسی بنت النیل کی اٹھتی جوانی کا نکھار، کسی فرعون کی حسین ملکہ کے تاج کا وقار، کسی زلیخا کے جذبۂ پرستش کی پاکیزگی، اور کسی قلوپطرا کے شباب کی رعنائیاں ہیں۔

ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی ہونے کے باوجود موسم نہایت خوش گوار

تھا، جسے نیل اور اس کے گرد و پیش کی فضا نے اور بھی نکھار دیا تھا۔ ابھرتے ہوئے چاند کی سنہری کرنیں نیل کی متحرک روپہلی سطح سے ہم آغوش ہوکر، اس کی رواں دواں لہروں کو گنگا جمنی بنا رہی تھیں، اور اس نے ماحول کی رومان انگیزی میں چار چاند لگا دیے تھے۔ اس طرب انگیز فضا اور اس مے بار ماحول میں چار بڑی بڑی کشتیاں ایک ساتھ جکڑ دی گئی تھیں، جن پر گدّے اور قالین لگے تھے۔ ایک درمیانی کشتی میں قیوم ایک سرے پر سکندرہ میں گم تھے اور دوسرے پر میں بیٹھا تھا۔ ہماری کشتی میں نشست کی خود رَو بے ترتیبی نے کچھ ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ بیش تر مرد ایک طرف اور عورتیں دوسری طرف تھیں۔

"خواتین و حضرات!" کسی نے بلند آواز سے کہا "نشست کی یہ ترتیب کچھ نامناسب سی ہے۔"

"آپ چاہتے کیا ہیں؟" ایک خاتون نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے سوال کیا۔

"مرد ایک طرف ہیں اور عورتیں دوسری طرف"۔ اس نے تجویز کی وضاحت کی "جیسے دو ٹیمیں مقابلے کے لیے صف آرا ہوں۔"

"اور آپ کو خطرہ ہے کہ مقابلہ ہوگیا تو آپ ہی کی ٹیم ہارے گی" ایک دبلی پتلی سی نوجوان خاتون نے جواب دیا، جس کا نام مجھے جولیہ بتایا گیا تھا۔

"مادموزیل جولیا!" نوجوان خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے کہا "ہماری ٹیم اگر ہاری، تو تاریخ آج پہلی بار اپنے کو نہ دہرائے گی - آدم کے وقت سے لے کر آج تک یہی ہوتا رہا ہے لیکن اس وقت تو ہم مصر کے بازار میں ہیں جہاں یوسف کو خریدنے کے بعد خود زلیخا اس کے ہاتھوں بک گئی تھی"۔

"یہ واقعہ تاریخی ہو یا تلمیحی" جولیہ نے مسکرا کر طنزیہ لہجے میں کہا "مصر کے بازار کا تو آج بھی یہی حال ہے. یہاں اکثر زلیخائیں کسی یوسف کو اسی لیے خریدتی ہیں کہ وہ خود اس کے ہاتھوں بک جائیں"۔

"میں اس بیان کے خلاف احتجاج کرتی ہوں" ایک خاتون نے چہک کر کہا۔

"تم مصری ہوتیں تو ہرگز یہ نہ کہتیں" ایک دوسری خاتون نے احتجاج کی تائید کی۔

"محترم خواتین! یہ احتجاج کا نہیں ترمیم کا محل ہے" معاملے کو رفع دفع کرتے ہوئے میں نے کہا "اس بیان میں مصر کی تخصیص یقیناً صحیح نہیں ہے. انسانی زندگی کے بازار کا بھی یہی چلن ہے، جہاں ہر زلیخا کسی نہ کسی یوسف کو اسی لیے اپناتی ہے کہ وہ خود اُسی کی ہو رہے"۔

"یہ بحث خطرناک رُخ اختیار کرتی جا رہی ہے" عادل نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"اور اس بحث میں اصل تجویز ہی گم ہو گئی" کسی دوسرے صاحب

نے کہا" اور جس مقابلے کا خطرہ تھا، وہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے"۔

"اجتماعی یا انفرادی جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی صورت حال پر قابو پا لیا جائے تو اچھا ہے"۔ میں نے تائید کی۔

"اچھا سب کھڑے ہوں" عادل نے جرنیلی حکم صادر کیا" اور آنکھ بند کر کے نہیں بلکہ آنکھ کھول کر اپنی اپنی نشستیں بدل لیں"۔

"نشستوں کے انتخاب کا پہلا حق عورتوں کو ملنا چاہیے" مصری تحریک نسواں کی ایک علم بردار خاتون نے کہا۔

"ایک طرف تو مردوں کے مساوی حقوق آپ مانگتی ہیں" کسی نے ان پر چوٹ کی" اور دوسری طرف عورتوں کے لیے ترجیحی سلوک کا بھی مطالبہ کرتی ہیں"۔

"ہمیں آپ کی تجویز منظور ہے" ایک صاحب نے خاتون کے مطالبے کی حمایت کی۔

"ہاں! ہاں!" سب نے اس کی حمایت کی۔

"میں آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟" میرے مقابل بیٹھنے والی خاتون جولیا نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے مجھ سے انگریزی میں سوال کیا۔

"اہلاً و سہلاً! مرحبا" اپنی جگہ سے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے عربی میں ان کا استقبال کیا۔ اس وقت چاند کی ہلکی اور خنک روشنی میں جولیا کی نازک صورت

بے حد دل فریب معلوم ہو رہی تھی۔

"اہلاً وسہلاً!" خاتون نے بھی عربی قاعدے کے مطابق استقبالیہ کلمات کو دہراتے ہوئے بتلایا "میں مصری نہیں ترک ہوں"۔

"یہ تو میں اس وقت کی جھڑپ سے سمجھ گیا تھا کہ آپ مصری نہیں ہیں، لیکن آپ کو ترکِ عیسائی نہیں، بلکہ لبنانی یا فلسطینی عیسائی سمجھتا تھا"۔

"آپ پھر غلطی کر رہے ہیں" خاتون نے ہنس کر کہا "میں مسلمان ہوں"۔

"معاف کیجیے" میں نے معذرت کی "عادل نے تعارف کراتے ہوئے جب آپ کا نام جولیا بتایا تھا تو مجھے گمان ہوا کہ آپ عیسائی ہیں"۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ملاحوں نے ان بندھنوں کو کھول دیا جنھوں نے ہماری کشتیوں کے چھوٹے سے قافلے کو پابندِ ساحل کر رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کنارِ نیل کی شوخ اور چنچل موجوں تے ہولے ہولے ان کا رخ منجدھار کی طرف موڑ کر انھیں تیز رو دھاروں کے حوالے کر دیا۔ اب ملاحوں نے جو گنتی میں دس بارہ تھے، لے سے لے ملا کر مدھم سروں میں کوئی طربیہ نغمہ چھیڑ دیا جس نے سمجھ میں نہ آنے کے باوجود، کان کی راہوں سے روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر دل و دماغ کی گزرگاہوں میں "چراغاں" کر دیا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، سحرِ نغمہ سے زیادہ شاید نوجوان ترک خاتون کے قرب کے اعجاز کو اس میں دخل تھا۔ غالبؔ نے شاید

قاہرہ کی ایک شام

کسی ایسے ہی ماحول سے دوچار ہو کر کہا تھا:

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

مصری دوستوں نے بھی نغمہ سرائی میں ملاحوں کے سُر سے سُر ملایا اور لَے نے بڑھتے بڑھتے کورس کی شکل اختیار کرلی، جس نے گرد و پیش کی فضا کو سرشاری و سرمستی سے شرابور کر دیا، اور ایسا لگتا تھا کہ اس تختِ رواں کے پر لگ گئے ہیں، اور اب یہ اڑنے ہی والا ہے۔ پھر نغمے کا اتار شروع ہوا۔ آوازیں آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو گئیں، اور ہر طرف سکوت، مکمل اور بھیانک سکوت، چھا گیا۔ کچھ دیر بعد ہوا کے تیز جھونکے نے نیل کی موجوں کے ساتھ ساتھ ہمارے تختِ رواں کو بھی زیر و زبر کرکے اُس سحرِ نغمہ کو درہم برہم کر دیا جس نے سب کو مبہوت کر رکھا تھا۔

"ترکوں کی طرح آپ کے کانوں کو بھی موسیقی سے خاص ربط معلوم ہوتا ہے" جولیا نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

"ترک تو موسیقی کے رسیا ہیں" میں نے جواب دیا "لیکن میرے کانوں کو موسیقی سے کوئی ربط نہیں ہے۔ مگر یہ نغمہ تھا یقیناً بڑا دلکش، جسے گرد و پیش کے ماحول نے، اور سب سے بڑھ کر آپ کے قرب نے دو آتشہ بنا دیا تھا۔"

"آپ شاعر بھی معلوم ہوتے ہیں۔"

"دیکھیے! مہربانی کرکے یہ تہمت مجھ پر نہ دھریے، شعر موزوں کرنا تو درکنار میں شعر موزوں پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اپنے

شاعر نہ ہونے کا مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا، مگر آج آپ سے مل کر اور آپ کو اپنے سے اتنا قریب پا کر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کاش میں بھی شاعر ہوتا۔"

"شعر کو اوزان کا پابند بنانا شعر کی توہین ہے۔ آپ میری اس رائے سے اگر متفق ہوں تو میں کہوں گی کہ آپ نے جو کچھ ابھی کہا ہے وہ خیال آرائی کی اچھی مثال ہے۔"

"شکریہ آپ کا" خاتون سے قریب تر ہوتے ہوئے میں نے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ ہم ہندستانیوں کو ترکوں سے دلی لگاؤ ہے، اور شاید یہی میرا قلبی تعلق آپ کو کھینچ کر میرے پاس لایا ہے۔"

"آپ کے بیان کا پہلا ٹکڑا تو یقیناً صحیح ہے، اور ممکن ہے کہ دوسرا بھی غلط نہ ہو۔"

"فارسی میں ترک کا لفظ" میں نے کہا "ترکی کے رہنے والوں کے معنی سے ہٹ کر ایک اور معنی میں مستعمل ہے۔ اور وہیں سے ہماری زبان اردو میں بھی آگیا ہے۔"

"فارسی سے مجھے بھی کچھ لگاؤ ہے، اور تھوڑی سی مجھے آتی بھی ہے" خاتون نے جواب دیا "آپ نے جو بات کہی ہے، اس کا مجھے علم ہے۔ لیکن مجھے ایک اور دل چسپ بات بھی معلوم ہے، اور وہ یہ ہے کہ فارسی میں ہندو بھی اُسی معنی میں مستعمل ہے جس معنی میں ترک۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں" خاتون کے بیان کو تسلیم کرتے

ہوئے میں نے کہا "ایران کے مشہور شاعر حافظ نے ترک اور ہندو دونوں کا ایک ہی شعر میں ذکر کیا ہے:

"اگر آن ترکِ شیرازی بدست آرد دل مارا
بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را"

"یہ شعر میرے حافظے میں بھی محفوظ ہے۔"

"آپ کو شاید نہ معلوم ہو" میں نے کہا "فارسی میں ہندو ڈاکو کو بھی کہتے ہیں۔"

"اس میں تعجب کی کون سی بات ہے" خاتون نے جواب دیا "دونوں معنوں میں تضاد نہیں، بلکہ قریبی ربط ہے۔"

"آپ خطرناک حد تک ذہین اور حاضر جواب ہیں" میں نے کہا "اچھا شاید آپ کو یہ نہ معلوم ہوگا کہ ہم ہندستانی ترکوں کا رشتہ کوہ قاف میں رہنے والی خیالی پریوں سے جوڑتے ہیں، لیکن آپ کو دیکھ کر محسوس ہو رہا ہے کہ حقیقت بھی یہی ہے۔"

"اس حُسنِ ظن کے لیے شکریہ" خاتونؔ نے قریب تر ہوتے ہوئے کہا "ہم ترکوں کے دلوں میں بھی ہندستانی مسلمانوں کے لیے ایک خاص جگہ ہے، لیکن اس کے وہ رومانی اسباب نہیں ہیں، جو آپ نے ترکوں سے منسوب کیے ہیں۔ بلکہ وہ انسانی قدروں اور ٹھوس حقایق پر مبنی ہے۔"

"ہمارے اور اپنے مذہبی رشتے کی طرف شاید آپ اشارہ کر رہی ہیں۔"

"نہیں! ہمارا یہ رشتہ تو عرب اور افریقہ کے تمام ملکوں کے

مسلمانوں کے ساتھ ہے" جولیا نے کہا" لیکن ہندستان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہم ترکوں کو دنیا کے دو ملکوں کے مسلمانوں سے دلی تعلق ہے — ہندستان کے اور پولینڈ کے مسلمانوں سے، جنھوں نے ہمیشہ ترکوں کا ساتھ دیا ہے۔ اور ہر آڑے وقت میں ہماری مدد کی ہے۔"

"کیا پولینڈ میں بھی مسلمان ہیں؟"

"ہاں پولینڈ میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے" جولیا نے پرخلوص نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا" اور وہ بھی اتنے ہی اچھے مسلمان ہیں، جتنے ہندستان کے۔"

پھر ہم ترکی ادب، ترکی رسم خط، ترکی سیاست اور ترکوں کے اسلامی تصورات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اسی سلسلے میں جولیا نے ترکی اور مصر کی اسلامی زندگی کا بڑے دل چسپ انداز میں موازنہ کیا، جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ مصریوں کے متعلق ان کی رائے اچھی نہیں ہے۔ میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ مصریوں کے باب میں ترکوں کا عام ذہن یہی ہے، اور اس کے نفسیاتی اور سیاسی اسباب ہیں۔ ان اسباب پر بھی نوجوان خاتون نے روشنی ڈالی۔

"خواتین وحضرات! اب رات کے ڈھائی بجنے والے ہیں" عادل نے اعلان کیا" اگر آپ کی اجازت ہو تو آج کی صحبت آپ سب کے شکریے کے ساتھ ختم کی جائے۔"

"ارے!" اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے میں نے کہا" یہ تو واقعی

ڈھائی بجے ہیں۔"

"باتوں میں اسی طرح وقت کے پر لگ جاتے ہیں" خاتون نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کاش وقت کی رفتار ہم روک سکتے!" میں نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

نوجوان ترک خاتون کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ دنیا کے اس حصے میں یہ پہلی ایشیائی نوجوان خاتون مجھے ملی تھیں، جن کی باتوں میں فکر کی گہرائی تھی، اور جنھیں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے پر بھی قدرت حاصل تھی۔

"پرسوں میری چوبیسویں سال گرہ ہے" کشتی سے اترنے میں میرے کاندھوں کا سہارا لیتے ہوئے جولیا نے کہا "آپ بھی ضرور تشریف لائیے۔ میری والدہ بھی آپ سے مل کر خوش ہوں گی۔ ہندستانی مسلمانوں کے باب میں ان کے جذبات بھی وہی ہیں جو میرے ہیں بلکہ مجھے تو یہ ان ہی سے ورثے میں ملے ہیں۔"

"میں ضرور آؤں گا" وعدہ کرتے ہوئے میں نے کہا "ایک بار آپ سے ملنے کے بعد دوسری بار پھر ملنے کی خواہش قدرتی بات ہے۔ بڑی مبارک ہے آپ کی سال گرہ کی یہ تقریب جس نے اتنی جلد اس آرزو کی تکمیل کا موقع فراہم کردیا۔ میں ضرور آؤں گا۔"

"شکریہ۔ آپ سے مجھے امید بھی یہی تھی" پھر کچھ رک کر جولیا

نے کہا "اچھا تو آپ ہی مجھے گھر تک پہنچا دیجیے تاکہ آپ جگہ بھی دیکھ لیں، اور پرسوں آپ کو وہاں پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہو۔"

قیوم میاں بیوی بھی ہماری ہی ٹیکسی میں آ گئے۔ راستے میں جولیا نے ان کو بھی دعوت دی۔ پھر انھیں اتارتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک بڑی سی عمارت کے سامنے جولیا نے ٹیکسی رکوائی۔ خدا حافظ کہنے کے لیے میں بھی گاڑی سے باہر نکلا۔
"دیکھیے! آپ ضرور آئیں گے" ہاتھ ملاتے ہوئے جولیا نے تاکید کی "اسی عمارت کی چوتھی منزل پر لفٹ سے نکلنے کے بعد داہنی طرف آپ گھومیں گے تو بائیں ہاتھ کو جو پہلا دروازہ ملے گا۔ وہی ہمارے فلیٹ کا دروازہ ہے۔ پرسوں جب وہاں پہنچیں تو دروازہ آپ کو کھلا ملے گا۔"

تین بجے گھر پہنچا تو تھکن سے چور تھا۔ لیٹتے ہی سو گیا۔ دوسرے دن دیر سے آنکھ کھلی، نہا دھو کر ناشتہ کرنے بیٹھا، تو ناشتے کا نہیں بلکہ کھانے کا وقت تھا۔ چنانچہ ناشتہ کھانے ہی کی طرح کیا، اور اخبار پڑھتے پڑھتے پھر سو گیا۔ پانچ بجے کے قریب گھر سے نکلا، اور یونین کے دفتر جاتے ہوئے، قیوم کے یہاں بھی چلا گیا۔
"کہیے، رات نیند آئی تھی؟" سکندرہ نے صاحب سلامت کے بعد سوال کیا۔
"رات بھی خوب سویا، اور آج دن بھر گھوڑے بیچ کر سوتا رہا۔"

"غالب نے انھیں کے لیے کہا تھا" قیوم نے میرا جواب سُن کر کہا:

"نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو"

"تم لوگوں کو رات نیند نہیں آئی؟" میں نے پوچھا "دماغ پر شاید اسی کا اثر ہے۔"

"تمھارا معاملہ تو ہم لوگوں سے مختلف تھا" قیوم نے کہا "رات تو تم جولیا میں ایسے کھوئے ——"

"اور وہ بھی ان میں ایسی کھوئیں کہ دنیا و مافیہا کی خبر ہی نہ رہی" سکندرہ نے میاں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگوں کے دماغ پر بلا وجہ میرا اور جولیا کا بھوت مسلط ہے" میں نے کہا "مجھے تو کل سے اس وقت تک اس کا خیال بھی نہ آیا — یار تم تو کمال کرتے ہو۔"

دوشنبہ کو حسب معمول دفتر پہنچا۔ دوپہر کے قریب عادل آگئے۔

"کہیے اپرسوں شام کی محفل کیسی رہی؟"

"بہت اچھی، بہت دل چسپ اور بہت کامیاب، مبارک ہو آپ کو۔"

"اس کی کامیابی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ دو روحیں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئیں۔"

"کون دو روحیں؟" میں نے گھبرا کر کہا "یہ اشارہ اگر میرے

اور جولیا کی طرف ہے تو صحیح نہیں ہے۔"
"ابھی ابھی جولیا کا ٹیلیفون آیا تھا" میرے جواب کو نظرانداز کرتے ہوئے عادل نے کہا "آج اس کی سال گرہ ہے۔ آپ کو اس نے خاص طور سے دعوت دی ہے۔"
"مجھ سے تو پرسوں ہی اس نے کہا تھا اور وعدہ بھی لے لیا تھا" میں نے جواب دیا "میں جاؤں گا بھی۔"
"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں" عادل نے ہنس کر کہا "اور اسی سے آپ انکار کر رہے تھے۔ اچھا تو پھر شام کو ساتھ چلیں گے۔"
"مجھے قیوم اور ان کی بیوی کو بھی لینا ہے" میں نے جواب دیا "اور پھر کسی جگہ وقت پر پہنچنا آپ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔"
"اور جناب تو وہاں جانے کے لیے ابھی سے بے تاب ہوں گے۔"
عادل کے جانے کے بعد پہلی بار میں نے پرسوں رات کی باتوں پر قیوم و سکندرہ اور عادل کے اظہار خیال کی روشنی میں غور کیا۔ یہ سب باتیں مجھے لغو معلوم ہوئیں، لیکن دل کی اتھاہ گہرائیوں میں یہ خدشہ بھی چھپا تھا کہ زبانِ خلق، کہیں، نقارۂ خدا نہ بن جائے۔ میں نے سوچا کہ آج جولیا کی سال گرہ میں نہ جاؤں تو اچھا ہے۔ بڑی دیر تک دل کو تولتا رہا، اور بالآخر فیصلہ بھی کر لیا۔ پھر میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے اس فیصلے کی جولیا کو

اطلاع دے دوں

"میں آج نہ آسکوں گا" میں نے ٹیلیفون پر جولیا کو اطلاع دی" اس لیے ٹیلیفون ہی پر میری مبارک باد قبول کیجیے۔"

"کیوں؟ آپ نے تو پکا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں، میں نے وعدہ کیا تھا اور تھوڑی دیر پہلے تک مصمم ارادہ بھی تھا۔"

"تو اب کیا بات ہوگئی؟"

"میرا نہ آنا ہی مناسب ہے" سکندرہ اور عادل کی باتیں دہرانے کے بعد میں نے کہا۔

"مجھ سے بھی عادل نے اور دوسرے لوگوں نے بھی اسی قسم کی باتیں کی ہیں لیکن میں نے ان کا کوئی اثر نہیں لیا۔ بہرحال آپ کو آنا ہے۔ اور میں آپ کا انتظار کروں گی" اور اس نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

پانچ بجے قیوم کے یہاں پہنچا تو دونوں میاں بیوی تیار بیٹھے تھے۔

"آپ تو خالی ہاتھ چلے آرہے ہیں" سکندرہ نے دیکھتے ہی سوال کیا "کوئی تحفہ نہیں لیا آپ نے؟"

"اس کا انتخاب میں نے تم پر اٹھا رکھا ہے" میں نے جواب دیا "چلتے ہوئے ابھی لے لیں گے۔"

ایک بڑی سی دوکان پر ٹیکسی روک کر سفید موتیوں کا ایک ہار میں نے خریدا۔ منزلِ مقصود پر پہنچا تو میزبان سفید سلک میں ملبوس مہمانوں کے استقبال کے لیے دروازے پر چشم براہ تھے۔ بڑی

گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔ اپنی والدہ سے تعارف کرایا۔

"سال گرہ کا تحفہ" ہار کا پیکٹ جولیا کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ آپ کا" کہتے ہوئے جولیا نے ہار کو ڈبے سے نکالا۔ اور بچوں کی طرح کھیلتے ہوئے کہا "کتنا خوب صورت ہے یہ۔ اسے آپ ہی میرے گلے میں ڈال دیجیے۔ اور آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ آج میں سفید اسکرٹ پہنوں گی"۔

"آپ کی خوش مذاقی سے، غیر شعوری طور پر، مجھے یہی توقع تھی" ہار پہناتے ہوئے میں نے کہا "اور ہمارے یہاں ایک مثل ہے کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے"۔

"آپ اگر آج نہ آتے تو مجھے صرف تکلیف ہی نہیں بلکہ بڑی مایوسی ہوتی"۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ عادل بھی آ گئے۔ سال گرہ کی مبارک باد دیتے ہوئے انھوں نے جولیا کے لباس کی سادگی کے ساتھ ساتھ اسکرٹ اور ہار کی ہم آہنگی کی خصوصیت سے تعریف کی۔

"اسکرٹ میرا انتخاب ہے" جولیا نے جواب دیا۔ پھر میری طرف اشارہ کیا "ہار ان کا انتخاب اور سال گرہ کا تحفہ ہے"۔

"تو تم دونوں ہم مذاق بھی ہو" عادل نے معنی خیز نظروں سے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس کے لیے میں دونوں کو مبارک باد دیتا ہوں"۔

"مبارک باد کا شکریہ، میری اور ان کی دونوں کی طرف

سے" جولیا نے سنجیدگی سے جواب دیا" دوستی کی ایک ضروری شرط ہم مذاقی بھی ہے۔" جولیا نے جس تیور سے یہ جواب دیا تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے وہ کہہ رہی ہو:

فاش می گویم و از گفتۂ خود دل شادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

مہمانوں کی تعداد خاصی تھی۔ ترکی، بلکہ عالم اسلام کی روایات کے مطابق کھانے پینے کے اہتمام میں نفاست اور فراخ دلی سے کام لیا گیا تھا۔ کھانے ترکی تھے جو ذایقے کے اعتبار سے ہندستانی مذاق سے قریب تر تھے۔ کباب اور دلما خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں جو بے حد خوش ذایقہ تھے۔

دو ڈھائی گھنٹے کی صحبت کے دوران میں اور جولیا کئی بار ایک دوسرے کے قریب آئے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے لیے ایک دوسرے میں گم ہوتے رہے۔

"شاید سب ہی ہندستانی دل پھینک ہوتے ہیں" ایک خاتون نے جن کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہوگی مجھے تنہا پاکر آہستہ سے کہا:

"ہندستانیوں کا شاید تم کو خاصا تجربہ ہے" ان کے جملے سے لطف لیتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

"آپ کو جولیا کے ساتھ دیکھ کر مجھے اپنے ہندستانی دوست یاد آ گئے" خاتون نے اس حسرت کے ساتھ کہا جیسے اپنی

بیتی ہوئی نوجوانی کی بھولی بسری یادوں کو تازہ کرکے عمر رفتہ کو آواز دے رہی ہوں" میری طالب علمی کے زمانے میں بہت سے ہندستانی بھی یورپ میں تھے۔ اور ان میں سے اکثر میرے قریبی دوست تھے۔"

"آپ مصری ہیں؟"

"نہیں جولیا کی طرح میں بھی ترک ہوں۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر" میں نے جواب دیا" جو بات آپ نے ہندستانیوں کے بارے میں کہی ہے۔ وہ شاید ترکوں پر بھی صادق آتی ہے۔"

"اس خیال میں صداقت کا شائبہ ضرور ہے" خاتون نے اعتراف کرتے ہوئے سوال کیا" ہندستان میں آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"لکھنؤ کے قریب کا۔"

"تو شاید میرے دوست سجاد ظہیر سے بھی آپ واقف ہوں، جنھیں ہم سب بنّے کہتے تھے۔"

"ہاں، اتفاقاً وہ میرے بھی دوست ہیں اور آج بھی ہم سب اسی نام سے انھیں پکارتے ہیں۔"

"اب بھی وہ کمیونسٹ ہیں؟"

"اب تو وہ کمیونسٹ لیڈر ہیں۔"

"ہمارے ایک اور دوست تھے، نواب زادہ امتیاز علی خاں، آپ ان سے بھی واقف ہیں؟"

"نہیں" میں نے دماغ پر زور دینے کے بعد جواب دیا۔
"وہ نواب کرنال کے بیٹے ہیں؟"
"میں انھیں نہیں جانتا۔"
"اچھا شوکت اللہ انصاری کو جانتے ہیں آپ؟"
"ہاں ان سے بھی خوب واقف ہوں" میں نے جواب دیا "اب تو وہ بھی آل انڈیا لیڈر ہیں"۔
"بنّے، امتیاز اور شوکت بڑے گہرے دوست تھے"۔
"اور آپ کی دوستی ان میں سب سے زیادہ کس سے تھی؟"
"شوکت سے" خاتون نے جواب دیا۔
یہ ترک خاتون دیر تک اپنے ہندستانی دوستوں کی باتیں مزے لے لے کر کرتی رہیں۔ اور جب ہم سب رخصت ہوئے تو میرے حلقۂ احباب میں ایک دوست کا خوش گوار اضافہ ہو چکا تھا۔

یہ بھیڑیوں کی لڑائی ہے بھیڑیوں کی

ٹیکسی سے باہر نکلتے ہوئے شپرڈس کے چبوترے پر نظر ڈالی، تو ایک بزرگ ہوٹل کی عمارت کے صدر دروازے سے لگے کھڑے تھے. ان کا پہناوا پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ یہ ہندستانی ہیں اور لکھنؤ یا اسی جوار کے رہنے والے ہیں. عراق، ایران اور مصر میں سترہ اٹھارہ مہینے رہنے کے بعد خالص ہندستانی سج دھج کے یہی پہلے آدمی مجھے نظر آئے تھے۔ ان ملکوں میں جو ہندستانی بس گئے ہیں، ان کی عورتیں تو عام طور پر ساڑی باندھتی ہیں مگر مرد اپنی کاروباری مجبوریوں سے، اور کچھ ان ملکوں کے عام چلن کی پیروی میں، کوٹ پتلون ہی پہنتے ہیں. ہاں سکھ، اور اکثر دوسرے پنجابی بھی، ہیٹ کی جگہ پر پگڑی باندھ لیتے ہیں۔

یہ قصہ ۲۳/ اگست ۱۹۴۶ء کی شام کا ہے۔ اگست کا مہینہ ہندستان میں یا تو موسلا دھار بارش کا ہوتا ہے، یا پھر سڑی

گرمی اور اُمس کا، لیکن قاہرہ میں سمندر سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں وہاں کے رتیلے ٹیلوں کو بھی تپنے نہیں دیتیں، اور برسات تو مصر میں نام ہی کو ہوتی ہے۔ اسی سے تو ابوالہول ــــ

وہ ابوالہول کہ ہے صاحب اسرار قدیم

نہ جانے کتنی صدیوں سے سر اٹھائے، سینہ تانے مصر کے اَن گنت انقلابوں کا خاموش تماشائی رہا ہے، اور مصر کے اہرام ہزاروں سال بیتنے کے بعد آج بھی بڑی آن بان سے کھڑے ہیں، جنھیں دیکھ کر غیر منقسم ہندستان کے شاعر اقبال نے حیرت سے کہا تھا :

اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر!

ابوالہول اور اہرام دونوں کی ابدیت کا راز یہی ہے کہ وہاں پانی برستا ہی نہیں۔ لیکن بارش کے اس فقدان کے باوجود ہندستان ہی کی طرح مصر بھی کھیتی باڑی کا دیس ہے۔ اس کی روئی کی تو دنیا بھر میں مانگ ہے۔ وہاں بارش کی کمی کو نیل کا گدلا پانی پورا کرتا ہے۔ اسی سے قدیم یونان کے ایک مورخ ہیروڈوٹس[1] نے، جسے عرب ہَرُدوت کہتے ہیں، مصر کو "ہدیتہ النیل" کہا تھا۔ ہندستانی کسان کو گنگا جمنا اور دوسرے دریاؤں سے جو لگاؤ رہا ہے، اس سے زیادہ مصری فلاّحین (کسانوں) کو اپنے اَن داتا نیل سے پریم رہا ہے۔ فراعنہ کے عہد میں، جب قدیم مصری تہذیب اپنے شباب

---

1. Herodotus

پر تھی، اور آج بھی مصری جس پر فخر کرتے ہیں، نیل کو دیوتا سمجھ کر اس کی پرستش کی جاتی تھی، اور ان کے مندروں میں دوسرے دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ نیل کی بھی مورتی ہوتی تھی۔ آج بھی مصر کے لوک گیت اور لوک کہانیاں نیل ہی کے گرد گھومتی ہیں۔ میلے ٹھیلے، عید بقرعید، اور دوسرے تہواروں کے موقعوں پر نیل کے کنارے سجائے جاتے ہیں اور وہاں میلے لگتے ہیں، جو ہندستان ہی کے میلوں جیسے ہوتے ہیں۔ ایک تو خاص نیل ہی کا تہوار ہوتا ہے، جسے "عروس النیل" کہتے ہیں، اور جس میں ہر طبقے کے مصری، بلا امتیاز مذہب، بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔

عروس النیل کا یہ تہوار اگست ہی کے مہینے میں قومی پیمانے پر منایا جاتا ہے۔ یوں تو اس کا سلسلہ کئی روز تک رہتا ہے، لیکن ایک دن پورے مصر میں سرکاری طور پر چھٹی ہوتی ہے۔ اس روز نیل میں ہر طرف رنگ برنگ کی رنگی چونگی، چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی کشتیاں رواں دواں نظر آتی ہیں، جن میں کسان ـــ مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے نیل کی عظمت اور اس کے ساتھ اپنی محبت و عقیدت کے راگ الاپتے، دیوانہ وار ناچتے گاتے نظر آتے ہیں۔ مصر کا یہ قومی تہوار ان دیہاتوں ہی میں نہیں منایا جاتا، جہاں نیل کے زرخیز پانی سے کھیت سینچے جاتے ہیں، بلکہ قاہرہ کی وہ شہری آبادی بھی، جو اپنے رہن سہن اور وضع قطع میں یورپ سے بہت قریب ہے، بلا تفریق جنس اور بلا امتیاز سن و سال اگر نیل میں نہیں، تو نیل کے کنارے ہی کھڑے ہو کر اس میں

حصہ لیتی ہے۔

عروس النیل کا تہوار اتنا ہی پرانا ہے، جتنی مصر کی تاریخ۔ یہ اس دور کی یادگار ہے، جب قدرت کے بھیدوں کو سمجھنا آدمی کے بس سے باہر تھا۔ اپنے سے بڑی اور اپنی سمجھ سے بالاتر ہر قوت کے سامنے سر جھکانا اور اسے طرح طرح سے پرچانا وہ ضروری سمجھتا تھا۔ اگست کے مہینے میں نیل کا اترتا ہوا پانی پھر چڑھنے لگتا ہے۔ پراچین مصر میں نیل کے پانی کا چڑھنا، نیل کے دیوتا کی خوشنودی کا مظہر اور خیر و برکت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اس موقع پر نیل کی وادی میں بسنے والے اپنی محبت و عقیدت اور احسان مندی کا مظاہرہ کرنے کے لیے مصر کی حسین ترین باکرہ کو دلہن بنا کر نیل کی چڑھتی ہوئی موجوں کی نذر کر دیا کرتے تھے۔ فراعنہ کے عہد میں یہ رسم بڑے تزک و احتشام سے منائی جاتی تھی۔ اسلامی دور کے مصر میں جیتی جاگتی حسینہ کی جگہ مصنوعی "عروس النیل" نے لے لی، لیکن اور مراسم میں کوئی فرق نہ آیا۔ قدیم روایت کی پیروی میں اسلامی حکمران بھی اس میں حصہ لیتے رہے، اور آج بھی مصری حکومت کے امیر و وزیر اس میں شریک ہوتے ہیں۔

عروس النیل، اور مصر کے دوسرے تہواروں میں بھی، مٹی اور شکر کے کھلونوں، مٹھائیوں، موسمی پھل پھلیریوں، اور کھانے پینے کی دوسری چیزوں کی دوکانیں، ہنڈولنا، چکر اور وہ سب کچھ نظر آتا ہے، جو ہندستانی میلوں ٹھیلوں میں ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یورپ کے جدید ترین فیشن کے مطابق کٹے

اور سلے اسکرٹس، کوٹ اور پتلون کے دوش بدوش، نچلے طبقے کی برقعہ پوش عورتیں، اور پیر تک لمبے کرتے۔ گلبیہ[ل] پہننے والے مرد بھی نظر آتے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ قاہرہ واقعی ایشیا اور یورپ کا سنگم ہے، جہاں پورب اور پچھم کے دو کلچر ملتے ہیں، اور آپس میں لین دین کرتے ہیں۔

ہندستان میں اگست کا مہینہ، جس کا ذکر کرتے ہوئے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، برسات، گرمی اور اُمس کا مہینہ ہونے کے باوجود، ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے دیس کی کھیتی باڑی پر اس کا جو اثر پڑتا ہے، اسے جانے بھی دیا جائے تو نئے ہندستان کی تاریخ کو بنانے اور بگاڑنے میں بھی اگست کے مہینے کا بہت کچھ ہاتھ رہا ہے۔ ۱۹۴۲ء کے اگست ہی میں ہمارے دیس نے "ہندستان چھوڑدو" کا نعرہ لگایا تھا، اس کے چار سال بعد اگست ۱۹۴۶ء میں ہندستان آزادی اور خانہ جنگی کے ایک خطرناک دوراہے پر کھڑا تھا۔ اُس وقت اس کے سامنے بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز راہیں تھیں۔ اسی اگست کے مہینے میں ایک طرف نیم مختار عارضی حکومت بننے کی بات چیت امید کے پتلے سے دھاگے کے سہارے چلتے چلتے ایک بڑے ہی نازک موڑ پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ دوسری طرف عارضی حکومت بننے میں بادھا ڈالنے کے لیے مسلم لیگ کے ڈائرکٹ ایکشن

ل: اصل لفظ جلبیہ ہے، جسے مصری گلبیہ کہتے ہیں۔

کی دھمکی کا عملی روپ کلکتے میں ہمارے سامنے آچکا تھا۔ دیس سے جو خبریں آرہی تھیں، خاص کر کلکتے سے، اُنھیں تو سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے تھے ـــــ ایسا لگتا تھا ـــــ جیسے شیخ چلّی کی طرح ہم نے بھی آزادی کا ایک خیالی محل کھڑا کیا تھا، پھر ہم ہی نے ایک ایسی لات گھمائی کہ خیالات کا سارا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ اور بس :

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ایسے وقت میں دیس سے کسی بھی آنے والے کا قاہرہ میں دکھائی پڑنا، اور پھر ایک ایسے آدمی کا جو لکھنؤ کا رہنے والا معلوم ہوتا ہو، کتنی بڑی نعمت تھی یہ !

ٹیکسی سے اترتے ہی نووارد ہندستانی پر میری نظریں اور جم کر رہ گئیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ایک پاؤنڈ کا نوٹ میں نے دیا، جس کے بھنانے میں اسے تین چار منٹ لگے۔ میں اتنی دیر ان ہی کو تکتا اور ان ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ ان کے جسم پر کالی شیروانی، کالی ٹوپی، سفید چوڑی دار پائجامہ، اور پیر میں سیاہ چمک دار بوٹ تھے۔ قد چھوٹا، رنگ گیہواں، اور بدن گول تھا۔ داڑھی مونچھ صاف تھی۔ گمان ہوا کہ یہ کوئی مسلم لیگی ہوں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ ہندستانی مولوی تو اپنے لباس میں یہاں آسکتا ہے، لیکن کوئی غیر مولوی یا مسلم لیگی، جن ٹل مین، اس پہناوے میں یہاں آنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ اور یہ صاحب جو مجھ سے بارہ پندرہ گز کے فاصلے پر کھڑے تھے مولوی نہیں مسٹر قسم

کے تھے. فٹ پاتھ کو پار کرنے کے بعد شپرڈس کے چبوترے پر پہنچتے ہی میرے قدم بے ارادہ ان کی طرف بڑھے اور قریب پہنچتے پہنچتے میں نے پہچان لیا:

"آپ سر مہاراج سنگھ ہیں؟" میں نے قریب جا کر سوال کیا۔

"ہاں میں مہاراج سنگھ ہوں، اور آپ؟"

اپنا نام بتانے کے بعد میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی. کچھ فاصلے پر ایک میز خالی دکھائی دی، اور ہم نے پہنچ کر اسی پر قبضہ کر لیا۔

"یا وَلد" بیرے کو میں نے آواز دی۔

"حاضر" کہتے ہوئے اس نے اشارہ کیا کہ وہ ابھی آتا ہے۔

"یہ یا وَلد کیا ہے؟" مہاراج سنگھ نے سوال کیا۔

"یہ عربی ترجمہ ہے انگریزی کے بوائے اور فرانسیسی کے گارسون کا" میں نے تشریح کرتے ہوئے بتلایا "یہاں ہوٹلوں، ریستورانوں اور قہوہ خانوں میں بوائے کو یا وَلد ہی کہہ کر آواز دیتے ہیں۔"

"اور کیا جواب دیا تھا اس نے؟"

"اس نے کہا تھا حاضر، لیکن آپ کو محسوس ہوا ہوگا کہ اس نے 'حادر' کہا ہے۔ عربی میں 'ض' کی آواز 'د' سے ملتی جلتی ہوتی ہے" اس کے بعد میں نے مہاراج سنگھ سے پوچھا کہ "آپ کے لیے کیا منگایا جائے؟"

"صرف ٹھنڈا پانی، اور کچھ لیا میں نے تو رات کا کھانا ختم ہو جائے گا۔"

اتنے فیصلہ کن انداز میں مہاراج سنگھ نے جواب دیا کہ مزید کچھ کہنے

کی مجھے جرأت نہ ہوئی۔

"واحد شا — دَمار بالتلگ" میں نے بیرے کو آرڈر دیا۔

"آپ کے آرڈر کا پہلا حصہ تو میں سمجھ گیا" مہاراج سنگھ نے میری عربی میں دل چسپی لیتے ہوئے کہا "لیکن اس کا دوسرا ٹکڑا میں بالکل نہیں سمجھا۔"

"میں نے کہا تھا 'مار بالتلگ' اس کے معنی ہیں پانی برف کے ساتھ" پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے میں نے بتلایا کہ "مار کے معنی ہیں پانی اور برف کو عربی میں ثلج کہتے ہیں —— ث، ل، ج۔ اردو میں ث، س اور ص کی آواز میں ہم فرق نہیں کرتے، لیکن عربی میں ث کی آواز ت اور تھ کی کے بیچ کی ہوتی ہے۔ اور مصر میں ج کی آواز کو گ کی آواز سے بدل دیتے ہیں۔ چناں چہ اردو کے مطابق جسے ہم ثلج کہیں گے، اسے مصر میں 'تلگ' بولا جاتا ہے۔"

"اچھا یہ بتایئے کہ مصر میں کوپٹس (قبطی عیسائی) اور مسلمانوں کے رہن سہن اور طور طریقوں میں کچھ فرق ہے؟"

"دونوں کی زبان، رہن سہن اور طور طریقوں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں کے رہنے والے تو بات چیت اور مزاج دقماش سے شاید سمجھ لیتے ہیں کہ کون قبطی ہے اور کون مسلمان، لیکن باہر سے آنے والے ان میں کوئی تمیز نہیں کرسکتے۔ میں آپ کو اپنا تجربہ سناؤں۔ پچھلے تین چار مہینوں سے میں عرب لیگ میں کام کر رہا ہوں۔ پہلی مرتبہ عرب لیگ

کے سکریٹری جنرل عزام پاشا سے ملا تو ہندستانی مسلمانوں کی باتیں کرتے ہوئے عرب عیسائیوں کا ذکر آگیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا کہ یہاں جب کوئی عیسائی عرب بھی اپنے کلچر کا نام لیتا ہے، تو اس کا مطلب اسلامی کلچر ہی ہوتا ہے۔ میرے ہندستانی ذہن کو ان کی یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ ابھی کوئی دو ہفتے ہوئے اسی مسئلے پر عزام پاشا کے سکریٹری سے باتیں کرتے ہوئے میں نے ان کی یہی بات دہرائی، تو اس نے کہا کہ عزام پاشا نے جو کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ میں عیسائی ہوں، لیکن میرا کلچر اسلامی کلچر ہے، اور اسی کو ہم عرب کلچر کہتے ہیں۔ یہ سن کر میں اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ جب سے عرب لیگ میں ہوں، اسے جانتا ہوں، ہر روز اس سے ملاقات اور بات چیت ہوتی ہے، لیکن یہ بات کبھی میرے وہم وگمان میں بھی نہ آئی کہ یہ شخص عیسائی ہے۔ میں اب تک اسے مسلمان سمجھتا تھا"

"یہ بہت بڑی بات ہے۔" مہاراج سنگھ نے کہا "اسی نے عرب قومیت کی جڑیں مضبوط کی ہیں۔"

"اس کی ایک بہت اچھی مثال مکرم عبید پاشا ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے تک وفد پارٹی میں مصطفےٰ نحاس پاشا کے دست راست تھے، آج کل اپنی الگ پارٹی بنالی ہے۔ عربی کے بہت بڑے مقرر اور خطیب مانے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قبطی عیسائی ہونے کے باوجود قرآن کو جتنا وہ جانتے اور

سمجھتے ہیں، کم مسلمانوں کو قرآن پر اتنا عبور ہوگا۔ اپنی تقریروں میں جس بے تکلفی سے قرآن کے حوالے وہ دیتے ہیں، شاید ہی کوئی دے سکتا ہو۔"

"اصل بات یہی ہے کہ عرب خواہ وہ ایشیا میں ہوں یا افریقہ میں، ان کا کلچر، ان کی زبان اور ان کا رسم خط ایک ہے۔ ہمارے یہاں اسی کی کمی ہے۔"

"ہمارے یہاں تو معاملہ بالکل برعکس ہے" مہاراج سنگھ کی تائید کرتے ہوئے میں نے کہا "آپ کے گھرانے جیسے کتنے عیسائی ہمارے یہاں نکلیں گے، جو اپنے پہناوے، رہن سہن اور بات چیت کے اعتبار سے ہندستانی معلوم ہوتے ہیں!"

"اچھا عربی تو آپ خوب بولنے لگے ہوں گے؟"

"خوب کیا بالکل نہیں بول پاتا" میں نے جواب دیا "بس دو چار ٹوٹے پھوٹے جملے آتے ہیں، کام تو انگریزی سے چلتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ عام طور پر لوگ یہاں انگریزی جانتے ہیں؟"

"ہاں یہاں کا پڑھا لکھا طبقہ عام طور پر انگریزی جانتا ہے، اور فرانسیسی بھی۔ پہلے تو فرانسیسی کا رواج زیادہ تھا، اب انگریزی عام ہوتی جا رہی ہے۔"

"انٹرنیشنل میدان میں بھی انگریزی نے فرانسیسی کو پچھاڑ دیا ہے۔ میرے بچپن تک یورپ میں فرانسیسی زبان اسی طرح عام

تھی، جیسے ہندستان میں اردو۔ فرانسیسی جاننا اور بولنا شرافت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ ڈپلومیسی کی زبان بھی فرانسیسی ہی تھی۔"

"اور یہاں تو نپولین کے آنے کے بعد ایک زمانے تک فرانسیسیوں کا بڑا دور دورہ رہا تھا" یہ کہتے ہوئے میں نے پوچھا "آپ یہاں تشریف کب لائے؟ اور اب کہاں کا قصد ہے؟"

"ابھی تو ڈھائی تین ہی گھنٹے ہوئے ہیں آئے ہوئے۔ پرسوں صبح کو ایسٹ افریقہ جانا ہے۔"

"ایسٹ افریقہ؟ کس سلسلے میں؟"

"ایک سرکاری تجارتی ڈے لی گیشن جا رہا ہے۔ دو ہندستانی اور میرے ساتھ ہیں، جو ابھی ابھی قاہرہ کی سیر کرنے نکلے ہیں۔"

"آپ کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا معلوم ہوتا ہے" کچھ دیر چپ رہنے کے بعد مہاراج سنگھ نے کہا "آپ کو میں نے کہیں دیکھا ضرور ہے، اور آپ کا لہجہ بھی لکھنؤ کے جوار کا سا ہے۔"

"آپ نے لکھنؤ ہی میں دیکھا ہے، لیکن کوئی نو دس سال اُدھر کی بات ہے۔"

"کچھ یاد دلایئے، کب اور کہاں دیکھا ہے!"

"۱۹۳۷ء میں جب کانگریس گورنمنٹ بنی، تو میں چیف وہیپس آفس کا انچارج تھا، اور آپ یو پی اسمبلی کے ممبر تھے۔"

"ہاں اب آپ کے کہنے سے مجھے بھی یاد آرہا ہے۔ وہ بھی عجیب زمانہ تھا۔"

"اس زمانے کی ایک بات مجھے نہیں بھولتی، جو نواب صاحب چھتاری نے آپ ہی سے کہی تھی۔ اپوزیشن لابی میں وہ آپ ہی سے باتیں کر رہے تھے، میں بھی کھڑا تھا۔ کسی بات پر نواب صاحب نے کہا — اب اس ہاؤس میں بڑی اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ یہ سن کر مجھے بڑا لطف آیا تھا۔"

"یہ قصہ تو مجھے نہیں یاد ہے، لیکن چھتاری کی بات غلط نہیں تھی۔ ہم سب کا یہی حال تھا۔ انگریزی ماحول میں ہم نے آنکھیں کھولی تھیں، اسی میں پلے اور بڑھے تھے۔ انگریزی روایات ہماری رگ رگ میں رچی بسی تھیں۔ کونسل کی ممبری بڑے اعزاز کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ ممبروں کا رکھ رکھاؤ بھی ایک خاص قسم کا ہوتا تھا، جو زیادہ تر تعلقدار ہی ہوتے تھے۔ چھوٹے طبقے کا بھی کوئی آدمی اگر کونسل کا ممبر ہو جاتا، تو وہ بھی ہم ہی لوگوں کے طور طریقوں پر چلتا، اور ہماری ہی باتوں کی نقل کرتا۔ اب ایکا ایکی حالت بدل گئی تھی۔ ہیٹ کی جگہ گاندھی کیپ نے، کوٹ پتلون کی جگہ کھدر کے دھوتی کرتے نے، اور چمک دار بوٹ کی جگہ چپل بلکہ چمرودھے جوتوں نے لے لی تھی۔ اس سے پہلے کبھی یہ نوبت نہیں آئی تھی، اور قیامت یہ تھی کہ حکومت ان ہی کھدر دھاریوں کی تھی، جو ہم ہی کو بری نظر سے دیکھتے

تھے۔ اب تو ہم سب بڑی حد تک اس کے عادی ہو گئے ہیں، اس سے یہ باتیں زیادہ اکھرتی نہیں ہیں۔ انگریزوں کے جانے کے بعد، جس میں اب دیر نہیں ہے، جو حالات پیدا ہوں گے، ان کے لیے کم از کم میں نے تو اپنے ذہن کو تیار کر لیا ہے۔"

"آپ لوگوں کی ذہنی کوفت کا ہمیں بھی احساس تھا، اور اس سے ہمیں تھوڑی سی خوشی بھی ہوتی تھی۔"

"آپ کے اندر بھی یہ جذبہ تھا؟"

"تھا، اور ضرور تھا" میں نے جواب دیا "مجھے بھی انگریز سے، انگریزی حکومت سے، اور انگریز پرستی سے یقیناً نفرت تھی، اور یہ مجھے وراثتاً ملی تھی۔"

"یہ نفرت تو ایک حد تک قدرتی تھی" مہاراج سنگھ نے اسے تسلیم کرتے ہوئے ہمارے اس دور کے ایک کمزور پہلو کی طرف اشارہ کیا "لیکن برسر اقتدار آنے کے بعد سرکاری افسروں، خاص کر پولیس کے ساتھ، کانگرس گورنمنٹ کا، اور عام کانگریسیوں کا رویہ تو قابل اعتراض حد تک ناروا تھا۔"

"جہاں تک کانگرس گورنمنٹ کا تعلق ہے، آپ کا خیال صحیح نہیں ہے" مہاراج سنگھ کے بیان کے پہلے حصے کی تردید کرتے ہوئے میں نے تسلیم کیا کہ "عام کانگرسیوں کا رویہ یقیناً سرکاری افسروں کے ساتھ عموماً اور پولیس کے

ساتھ خصوصاً کچھ حد تک ناروا تھا' اور میں بھی عام کانگریسوں ہی میں تھا۔ لیکن اس روش کو غلط سمجھتے ہوئے بھی میرا خیال ہے ہمارا یہ جذبہ، جسے انتقام ہی کا نام دیا جا سکتا ہے، تھا بالکل قدرتی۔ ہم عام کانگریسی فرشتے نہیں، بلکہ انسان تھے۔ پچھلے پندرہ بیس برسوں میں پولیس نے، اپنا فرض منصبی ادا کرنے ہی کے لیے سہی، ہم پر بے پناہ مظالم کیے تھے۔ اور یہ سب سرکاری افسروں کے حکم، یا کم از کم ان کے اشارے ہی سے ہوا تھا۔ ان سب باتوں کو اک بارگی بھولنا ہمارے کیا کسی انسان کے بس کی بات نہ تھی۔"

"آپ کی اس بات میں کچھ نہ کچھ وزن ضرور ہے" مہاراج سنگھ نے دبے لفظوں میں اتفاق کیا۔

"کچھ نہ کچھ نہیں" میں نے اپنی بات پر اصرار کیا "اس میں بہت وزن ہے۔ ابھی ابھی میں نے اعتراف کیا تھا کہ میں بھی عام کانگریسوں ہی میں تھا' اور میرے جذبات بھی عام کانگریسوں ہی جیسے تھے۔ اس جگہ میں اپنے ایک ذاتی رجحان کا بھی ذکر کروں گا۔ میرے شعور نے ہوش سنبھالا تو ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بغاوت کی آگ سلگ رہی تھی۔ کانگریس اور برطانوی سامراج ایک دوسرے سے بے طرح گتھے تھے۔ برطانوی سامراج کے مظالم ہی نے ملک میں دہشت پسندی کی تحریک کو جنم دیا تھا۔ بھگت سنگھ چندر شیکھر آزاد' اور دوسرے

شہید اس تحریک کا روشن منارہ تھے، اور اُس دور کے نوجوانوں کے دل و دماغ پر بے طرح چھائے ہوئے تھے. دہشت پسند تحریک کے ساتھ مجھے بھی ہمدردی تھی. کانگرس تحریک میں عملی طور پر آتے ہی اپنے دور کے اور نوجوانوں کی طرح میرے تعلقات بھی ان کمیونسٹوں سے پیدا ہوئے، جو اس وقت کانگرس ہی میں تھے، اور دہشت پسند تحریک سے گہرا تعلق اگر نہیں تو گہری دلچسپی ضرور رکھتے تھے. پولیس نے دہشت پسندوں کو خاص طور سے اپنے مظالم کا نشانہ بنایا تھا۔ ان اسباب کی بنا پر ہم سب کو پولیس سے شدید نفرت تھی. لیکن یہ بات کانگرس گورنمنٹ پر صادق نہیں آتی۔ اس سلسلے میں اپنا ایک ذاتی واقعہ سناؤں آپ کو، جس سے کانگرس گورنمنٹ اور عام کانگرسی ذہن کا فرق آپ کو معلوم ہوگا۔

"چیف دہلیس آفس میں کام شروع کرنے کے چند ہی روز بعد اسمبلی کا پہلا اجلاس شروع ہوا. میرے ایک دوست نے وزیٹرس گیلری[لے] کے پاس کی مجھ سے فرمایش کی، جسے بنوا کر میں نے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ اسمبلی ہال کے صدر دروازے پر پہنچ کر انھوں نے مجھے خبر بھجوائی. میں نے جا کر ان کو پاس دیا تو ایک سب انسپکٹر نے، جو ڈیوٹی پر

لے Visitor's Gallery

تھا، میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسے شک ہوا کہ یہ کسی ایسے آدمی کا پاس ہے جو اوپر گیلری میں جا چکا ہے۔ میں نے اسے یقین دلانے کی بہت کوشش کی، لیکن اس نے میری بات نہ مانی۔ اس کی آواز بھی تیز ہونے لگی۔ مجھے بھی غصہ آیا، اور میں نے بے دھڑک ہاتھ گھما دیا اور اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آیا۔ اس وقت تو سب انسپکٹر خاموش ہو گیا، لیکن بعد میں اس نے اسپیکر سے باضابطہ رپورٹ کی۔ ٹنڈن[1] جی کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ مجھے بلا کر انھوں نے بازپرس کی۔ میں نے سچی بات انھیں بتا دی، اور اسمبلی کے اس ممبر کو بھی لے جا کر ان کے سامنے کھڑا کر دیا جس کی معرفت پاس بنا تھا، اور اپنی غلطی بھی مانی۔ اس سے ان کا پارہ کچھ نیچے اترا، لیکن اس شرط پر انھوں نے معاف کیا کہ سب انسپکٹر سے میں معافی مانگوں۔ دوسرے دن مجھے بلا کر انھوں نے سمجھایا کہ پولیس اب انگریز کی نہیں بلکہ جنتا کی ہے، ہماری ہے، ہم ان کی بے عزتی کریں گے، تو وہ اپنا کام نہ کر سکیں گے، اور اس میں ہماری ہی بدنامی ہو گی۔"

"ٹنڈن جی آدمی اصول پرست ہیں" مہاراج سنگھ نے کہا "انھیں کم سے کم یہی کرنا چاہیے تھا۔"

---

[1] پرشوتم داس ٹنڈن یوپی اسمبلی کے اسپیکر تھے۔

"تو یہ تھی ٹنڈن جی کی اصول پرستی" میں نے کہا "اب سنیے پیارے لال شرما[1] اور پنتھ جی[2] کی اصول پرستی۔ جب کانگرس گورنمنٹ بنی تو میرے ایک ہم وطن دوست اور عزیز انصار ہروانی علی گڑھ یونیورسٹی میں ال، ال، بی کے طالب علم تھے۔ طالب علموں کی تحریک سے ان کا گہرا تعلق تھا، اور اسی وجہ سے اس زمانے میں بھی اچھے خاصے لیڈر تھے۔ وہ لکھنؤ آئے تو شرما جی سے بھی ملے، اور علی گڑھ یونیورسٹی کے وایس چانسلر ڈاکٹر ضیار الدین کی شکایت کی۔ شرما جی کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ ایک طالب علم اپنے وایس چانسلر کی وزیر تعلیم سے اس طرح برائی کرے۔ انھوں نے یہ بات ڈاکٹر ضیار الدین کو لکھی، اور انھوں نے انصار ہروانی کو رسٹی کیٹ کر دیا۔ اس وقت یو، پی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سکریٹری میرے اور انصار ہروانی کے ایک دوست بلرام سنگھ تھے۔ پنتھ جی سے وقت مقرر کر کے ایک وفد کے ساتھ وہ ان سے ملنے سکریٹریٹ پہنچے۔ پہلے میرے ہی کمرے میں چلے آئے۔

"چار آدمیوں کا ملنا پنتھ جی سے طے ہوا ہے" بلرام سنگھ نے مجھ سے کہا "ایک صاحب آئے نہیں ہیں۔ تم ان کی جگہ پر چلے چلو۔"

---

[1] میرٹھ کے رہنے والے، پرانے کانگرسی اور یو، پی کے پہلے کانگرسی وزیر تعلیم تھے۔

[2] گووند ولبھ پنتھ، یو، پی کے پہلے کانگرسی وزیر اعلیٰ۔

میری شامت آئی تھی، میں تیار ہو گیا۔"

"آپ بھی ڈیپوٹیشن کے ساتھ ہیں" کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد پنتھ جی نے مسکرا کر سوال کیا۔

"جی ہاں اس وقت ہوں تو" میں نے جواب دیا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ پھر کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد پنتھ جی نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور اپنے پیڈ کے نیچے رکھ لیا۔ میں نے کچھ خیال بھی نہ کیا، لیکن بلرام سنگھ کی سمجھ میں بات آگئی۔

"ایک مرتبہ پھر پنتھ جی کے یہاں آنا ہوگا" باہر نکل کر بلرام سنگھ نے مجھ سے کہا "انصار کا معاملہ تو بن جائے شاید، لیکن بیٹے! تمھارا پتا کٹ گیا۔"

"بے وقوف ہیں آپ اچھے خاصے۔" میں نے جواب دیا۔

لیکن بلرام سنگھ کی بات صحیح نکلی، اور ایک ہفتے بعد مجھے نوٹس مل گیا کہ آپ کی خدمات کی اب ضرورت نہیں ہے۔ میں دوڑا ہوا قدوائی صاحب[1] کے پاس گیا، جنھوں نے مجھے یہ جگہ دلوائی تھی۔

"پنتھ جی نے تو ایک ہفتہ ہوئے یہ قصہ مجھ سے بیان کیا تھا" قدوائی صاحب نے جواب دیا "آپ یا تو لیڈری کیجیے یا نوکری، دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتی ہیں۔ آپ یو۔پی کانگرس کمیٹی میں کام کیجیے۔ وہاں ماس کان ٹیکٹ ڈپارٹمنٹ کو اردو میں خبر نامہ نکالنے کے لیے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ میں نے

---

[1] رفیع احمد قدوائی

آپ کے لیے نیاگی[1] سے کہہ دیا ہے۔"

"آپ نے یہ نہیں بتلایا کہ رہنے والے آپ کہاں کے ہیں؟"

مہاراج نے سوال کیا۔

"لکھنؤ سے پچپن میل کے فاصلے پر ایک قصبہ ہے ردولی" اودھ میں۔

"اچھا تو آپ ردولی کے رہنے والے ہیں" مہاراج سنگھ نے کہا "جہاں کے چمرو[2] ہیں۔"

"جی ہاں وہیں کا رہنے والا ہوں" میں نے جواب دیا "اور چمرو میرے قریبی عزیز ہیں" میں انھیں چمرو دادا کہتا ہوں"۔

"پھر تو گھر ہی کے ہو تم" مہاراج سنگھ نے بڑی شفقت سے فرمایا "چمرو میرے گہرے دوست ہیں۔ اودھ کے مسلمان تعلقداروں میں وہ پہلے آدمی تھے جنھوں نے اپنی لڑکیوں کو بورڈنگ ہاؤس میں رکھ کر باضابطے انگریزی تعلیم دلائی۔ باتیں بھی خوب کرتے ہیں، میں نے ان سے اچھا باتیں کرنے والا نہیں دیکھا، بچوں میں بچوں کی سی، جوانوں میں جوانوں کی سی اور بوڑھوں میں بوڑھوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ میرے خاندان کے ہر فرد سے چاہے بڑا ہو یا چھوٹا ان کی یکساں دوستی ہے۔"

---

[1] مہادیر نیاگی۔

[2] چودھری محمد علی ردولوی۔ ان کا گھریلو نام چمرو ہی تھا۔

"ردولی میں بھی ان کا یہی حال ہے۔ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سے ان کی دوستی ہی نہیں بلکہ بے تکلفی بھی ہے۔ اور لکھتے بھی وہ بہت اچھا ہیں، اودھ کی قصباتی زندگی کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے، اور اس کی تلخی تصویر پیش کرنا ان ہی کا حصہ ہے۔"

تم نے بالکل سچ کہا ہے" مہاراج سنگھ نے میری تائید کی "ان کا کمال یہ ہے کہ اپنے اردگرد کے لوگوں کی زندگی جوں کی توں پیش کر دیتے ہیں۔ اور اس میں بعض وقت وہ بڑی بے دردی سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور میں نے سنا ہے کہ وہ ہومیوپیتھ بھی بہت اچھے ہیں۔"

"ہاں وہ بہت اچھے ہومیوپیتھ ہیں۔ باضابطہ مطب کرتے ہیں، اور پوری ذمے داری کے ساتھ کرتے ہیں۔ مفت دوا دیتے ہیں۔"

"اور جنسیات سے بھی انھیں گہری دل چسپی ہے" مہاراج سنگھ نے کہا "عملی بھی اور نظریاتی بھی۔"

"اس موضوع پر انھوں نے پڑھا بھی بہت ہے اور لکھا بھی ہے۔"

رات کا کھانا ہم دونوں نے "خمایس" میں کھایا، جو شیپرڈ کی بغل ہی میں ہے، اور قاہرہ میں اپنے کبابوں کے لیے مشہور ہے۔ اندر ہال میں جگہ نہیں تھی، اس لیے ہم سڑک کے کنارے فٹ پاتھ

ہی پر بیٹھ گئے۔ مصر کے اعلا اور درمیانی طبقے کی زندگی پر فرانسیسی کلچر کی بڑی گہری چھاپ ہے۔ وہاں فرانسیسی اسی طرح بولی جاتی ہے جیسے بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں انگریزی۔ فرانس ہی کے رواج کے مطابق قاہرہ کے ہوٹلوں، رستورانوں اور قہوہ خانوں کے سامنے فٹ پاتھ پر میز کرسیاں پڑی رہتی ہیں، اور گاہک وہاں بیٹھ کر بے تکلفی سے کھاتے پیتے ہیں۔

"آپ مصری کھانا کھائیں گے یا یورپین؟" میں نے مہاراج سنگھ سے پوچھا۔

"تم کیا کھاؤ گے؟" انھوں نے مجھ سے سوال کر دیا۔

"خمایس کی تین چیزیں مجھے پسند ہیں — ملوخیا، مسور کی دال جسے یہاں عدس کہتے ہیں اور کباب!"

"یہ ملوخیا کیا ہے؟"

"یہ ایک گھاس ہے۔ فلاحین کی غذا یہی ملوخیا اور روٹی ہے۔ شہری آبادی اس کا سوپ پیتی ہے۔ پکنے کے بعد اس کا شوربہ اتنا لس دار ہوتا ہے کہ تار چھوٹنے لگتا ہے۔ یہاں دال روٹی یا دال چاول کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اور مسور کی دال کا بھی سوپ ہی بنتا ہے، جو اور چیزوں کے سوپ سے گاڑھا ہوتا ہے۔ یہاں جسے کباب کہتے ہیں، اسے ہمارے یہاں تکہ کہتے ہیں۔"

"کھانے میں مسور کی دال اگر آپ منگائیں تو یورپ کے رواج کے مطابق، پہلے اس کا سوپ آئے گا۔ پھر

ایک ایک کرکے دوسری چیزیں آپ کے سامنے لائی جائیں گی۔ میں تو اپنے آرڈر کے ساتھ یہ بھی ہدایت کرتا ہوں کہ سب چیزیں ایک ساتھ لائی جائیں۔ پھر چھری کانٹے کو ایک طرف رکھ کر، ہندستانی طریقے سے، دال میں روٹی ڈبوکر، اور دال چاول ملا کر کھاتا ہوں، قریب بیٹھنے والے میرا منہ تکتے ہیں، لیکن میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔"

یہ قصہ اس رات کا ہے، جس کے دوسرے دن ہندستان کی عارضی حکومت جنم لینے والی تھی۔ کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے مہاراج سنگھ نے ہندستان کا بڑا بھیانک نقشہ پیش کیا۔

"وہاں کا حال کیا بتائیں تمھیں" انھوں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا "نہ دیکھنے کے قابل ہے نہ سننے کے۔ ایک طرح کی جنگ ہے، جسے جنگ کا بھی نام نہیں دیا جا سکتا۔ جنگ کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہاں آدمی آدمی نہیں رہا، درندہ ہو گیا ہے۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے کلکتے میں تین[1] دن تک گھمسان کا رن پڑا۔ اسے تم مبالغہ نہ سمجھنا۔ وہاں جس بے دردی سے کے ساتھ انسانی خون سے ہولی کھیلی گئی ہے، اس کی دوسری مثال ہندستان کی تاریخ میں تو ملتی نہیں۔ میاں یہ بھیڑیوں کی لڑائی ہے، بھیڑیوں کی۔ ایک دوسرے کو

---

[1] ۱۶، ۱۷، ۱۸ اگست ۱۹۴۶ء۔ اس فساد میں کم از کم چھ ہزار انسان مارے گئے اور بیس ہزار مجروح ہوئے۔

کھا جانا چاہتا ہے، چبا جانا چاہتا ہے"۔

"اس مہینے کے شروع میں لیاقت علی خاں نے کہا تھا" میں نے یہ سن کر کہا "کانگرس نے عارضی حکومت بنانے کی اگر کوشش کی تو ہمارے ڈائرکٹ ایکشن شروع کرنے کا یہی اشارہ ہوگا، اور جو حکومت بنے گی، اسے ہم ناکام بنا دیں گے"۔

"کلکتے میں جو کچھ ہوا" مہاراج سنگھ نے کہا "یہ اگر ڈائرکٹ ایکشن کی ابتدا ہے، تو خدا ہی جانتا ہے کہ اس کی انتہا کیا ہوگی"۔

"اس میں ہندستان کے انگریز سیول اور فوجی افسروں کا بھی ہاتھ ہوگا، جنھیں کانگرس سے بغض اور مسلم لیگ سے ہمدردی ہے۔ یہ تقریباً سب کے سب کنزرویٹو ہیں، جنھیں برطانیہ کی لیبر گورنمنٹ سے بھی شدید نفرت ہے، جو ہندستان کو آزادی دینے کا اعلان کر چکی ہے۔ ہندستان میں خانہ جنگی کی فضا پیدا کر کے کانگرس اور لیبر گورنمنٹ دونوں کو یہ نیچا دکھانا چاہتے ہیں"۔

"اس خیال میں سولہ آنے تو نہیں، لیکن کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے" مہاراج سنگھ نے اعتراف کیا "لیکن اسے تسلیم کر لینے کے بعد بھی ہماری ذمے داری ختم نہیں ہو جاتی"۔

"ہماری سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" میں نے سوال کیا "کلکتے میں جو کچھ ہوا اس کی ذمے داری براہ راست بنگال کی مسلم لیگی حکومت پر ہے"۔

"ہماری سے مراد ہماری سیاسی پارٹیاں — کانگرس اور مسلم لیگ

ہیں" مہاراج سنگھ نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "کلکتے میں جو کچھ ہوا، اس کی ذمے داری کا فیصلہ کرنے سے کہیں زیادہ ضرورت آج اس بات پر غور کرنے اور اس کی راہیں ڈھونڈھنے کی ہے کہ کورو پانڈو کا یہ ناٹک ملک کے کسی حصے میں دوبارہ نہ کھیلا جا سکے۔ مجھے دکھ ہے کہ مسئلے کے اس پہلو پر کوئی غور نہیں کر رہا ہے۔"

"آپ نے اس پہلو پر غور کیا ہے؟" میں نے براہ راست سوال کیا۔

"ہاں! میں نے تو غور اور بہت غور کیا ہے" اپنی بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے کہا "لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ گاندھی جی کچھ کر سکیں تو کر سکیں، ورنہ کسی اور کے بس کی بات نہیں ہے، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے، ملک اس وقت گاندھی کی بات بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"یہ تو بڑی نازک صورت حال ہے۔"

"ہاں بڑی نازک۔ بات یہ ہے کہ ہر شخص کو دو باتوں کا یقین ہو گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہندستان کی برطانوی حکومت کے دن پورے ہو چکے ہیں، دنوں کی اگر نہیں تو اب وہ مہینوں کی مہمان ہے۔ دوسرے یہ کہ کانگرس اور مسلم لیگ میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں احساسات نے پورے ملک میں ایک مزاجی کیفیت پیدا کر دی ہے، اور کوئی کسی کی سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اسی نے بہتوں کے اوسان کھو دیے ہیں۔ ان ہی میں مسٹر جناح اور ان کی مسلم لیگ بھی ہے۔ اس

حقیقت سے بھی مسٹر جناح خوب واقف ہیں کہ انگریز قوم صرف وقت کا ساتھ دیتی ہے۔ ہندستان پر جب تک اسے حکومت کرنی تھی، اس وقت تک مسلم لیگ کی اسے ضرورت تھی کل اسے ہندستان کے ساتھ تجارت کرنی ہوگی، اور اس کے لیے ضرورت ہوگی اُسے کانگرس کی، جو ہندستانیوں کی اکثریت کی نمایندہ ہے، اور اسی کے ہاتھ میں طاقت آنے والی ہے۔"

"ایک بات اور بھی ہے" مہاراج سنگھ کی بات کاٹتے ہوئے میں نے کہا "مسلم لیگ کی تاریخ ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ اپنے ماضی پر شرمندہ ہونے سے کہیں زیادہ آج وہ اس سے خائف بھی ہوگی۔"

"ممکن ہے کہ آپ کا یہ خیال صحیح ہو" مہاراج سنگھ نے کہا "لیکن مسلم لیگ کی پوزیشن میں اس سے کمزوری نہیں آئی ہے۔"

"ہاں! یہ درست ہے" میں نے کہا "مسلمانوں میں مذہبی جنون پیدا کر کے مسلم لیگ نے آج ان کی اکثریت کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا ہے۔"

"اور یہ اکثریت دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ پچھلے انتخابات میں، جسے ابھی چند ہی مہینے ہوئے ہیں مسلم لیگ کو مسلمانوں کے ۵۶ فی صدی ووٹ ملے تھے۔ آج پھر اگر نئے انتخابات ہوں تو یہ تناسب کم از کم ڈیوڑھا ہو جائے گا۔ اور یہ سب مرنے مارنے کے لیے تیار ہیں۔ یاد رکھو جو کلکتے میں ہوا ہے،

وہ ملک کے ان تمام حصوں میں ہو سکتا ہے، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ہندو اس کا ان علاقوں میں جواب دیں گے، جہاں ان کی اکثریت ہے۔ یہ ایک ایسا چکر بن جائے گا جس کا ٹوٹنا آسان نہ ہوگا۔ اس کا کیا نتیجہ ہوگا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

"سر مہاراج سنگھ میرا خیال ہے" میں نے کہا "یہ آزادی کی قیمت ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں۔ یہ حالات کچھ اسی قسم کے ہیں جن سے عورت بچہ جننے سے پہلے گزرتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ تمھارا خیال صحیح ہو" مہاراج سنگھ نے اداس لہجے میں کہا "لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں زچہ و بچہ دونوں ہی کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ ہندستان میں بہت سے لوگ تمھاری ہی نہج پر سوچتے ہیں، جواہرلال کے سوچنے کا بھی یہی انداز ہے۔ لیکن یہ مسئلے کا حل ڈھونڈھنے کا ڈھنگ نہیں، بلکہ اس سے بھاگنے کی ایک آسان راہ ہے۔ میں بوڑھا ہوں ممکن ہے مر جاؤں، لیکن میری یہ بات یاد رکھنا کہ مسلم لیگ اور کانگرس میں سمجھوتہ نہ ہوا تو ہندستان میں خون کی ندیاں بہیں گی، خون کی ندیاں، جسے دیکھ کر ہلاکو و چنگیز کی روحیں بھی شرمائیں گی۔"

مہاراج سنگھ کی بھیانک پیشین گوئی سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ یہ باتیں کوئی مسلم لیگی کہتا تو شاید مجھے غصہ آتا، لیکن ان کی باتوں میں درد اور خلوص تھا۔ یہ ایک برل کی باتیں تھیں، جو نہ کانگرسی

تھا، اور نہ مسلم لیگی۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے، جیسے مستقبل کے بھیانک تصور سے سہم گئے ہوں۔

"کل ۲۴ اگست ہے نا؟" تھوڑے سے وقفے کے بعد مہاراج سنگھ نے سوال کیا۔

"جی ہاں کل ۲۴ اگست ہے۔"

"تو کل ہی عارضی حکومت کے ممبروں کے نام کا اعلان کیا جائے گا، اور رات کے ساڑھے آٹھ بجے لارڈ ویول آل انڈیا ریڈیو سے تقریر نشر کریں گے۔" پھر کچھ جھجکتے ہوئے انھوں نے سوال کیا "اس کے سننے کی کوئی صورت ممکن ہے؟"

"قطعاً ممکن ہے" میں نے مستعدی سے جواب دیا "ہندستان کے ساڑھے آٹھ بجے کے معنی ہیں یہاں کے پانچ بجے۔ کل تیسرے پہر کو چائے آپ میرے یہاں پئیں، اور وہیں ویول کی تقریر اور خبریں سنیے۔"

"اچھی بات ہے۔"

"میں سوا چار بجے کے قریب آجاؤں گا، اور آپ کو اپنے ساتھ لے چلوں گا۔"

"بس یہ پروگرام طے رہا۔"

"اور آپ اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی چائے اور ویول کی تقریر سننے کی میری طرف سے دعوت دے دیں۔"

"اب وہ دونوں آگئے ہوں گے۔ تم تو ان سے کہہ دو۔"

کھانے کا بل ادا کرنے کے بعد، جو میرے اصرار کے باوجود مہاراج سنگھ ہی نے ادا کیا، ہم دونوں شیرڈس پہنچے، تو اس کے

چبوترے ہی پر، جس کی بھیڑ اب چھٹ چکی تھی، مہاراج سنگھ کے دونوں ساتھی بیٹھے تھے۔

"یہ ہیں مسٹر جھا۔" مہاراج سنگھ نے ان کا تعارف کرایا۔

"آپ امرناتھ جھا کے عزیز ہیں؟" میں نے تعارف کے بعد مسٹر جھا سے سوال کیا۔

"یہ سوال مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے" انھوں نے ہنس کر جواب دیا "اور مجھے نہیں کہنا پڑتا ہے۔"

میری دعوت پر دونوں نے معذرت کرتے ہوئے بتلایا کہ کل دن کے کھانے کے بعد انھیں اہرام کی سیر کے لیے جانا ہے، جہاں سے ان کی واپسی چھ بجے کے بعد ہوگی، اور یہ پروگرام کسی کے ساتھ وہ طے کر چکے ہیں۔

قاہرہ میں سب سے زیادہ جس سے میں ڈرتا تھا، وہ میری اطالوی بوڑھی لینڈ لیڈی تھی۔ اس کی ایمان داری اور خلوص و محبت نے مجھے زیر کر لیا تھا۔ میرے مہمانوں کا آنا اسے بے حد گراں گزرتا تھا، جسے وہ میرے اسراف پر محمول کرتی تھی۔ چناں چہ دوسرے دن گھر سے نکلتے ہوئے میں نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"آج شام کی چائے پر ایک معزز مہمان آئیں گے۔"

"تمھارا تو ہر مہمان معزز ہوتا ہے" حسبِ معمول اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

---

[1] سی، اس، جھا

"ان کی میں بہت عزت کرتا ہوں" میں نے مزید کہا "اور وہ میرے ہم وطن ہی نہیں بلکہ میرے شہر ہی کے رہنے والے ہیں۔"

"اچھا تو پھر اسی سے معزز بھی ہیں!"

فرانسیسی زبان اس بوڑھی خاتون کی کمزوری تھی۔ اپنی اطالوی زبان سے بھی کچھ زیادہ ہی فرانسیسی سے شاید اُسے لگاؤ تھا۔ اس کی وہ بڑی ہی رسیا تھی۔ فرانسیسی سیکھنے کے ڈھرے پر مجھے بھی لگانے کی اس نے بہت کوشش کی، لیکن میں زبانیں سیکھنے کے معاملے میں کچھ کم نصیب واقع ہوا ہوں، اس لیے شُد بُد سے آگے بات نہ بڑھ سکی۔ بوڑھی خاتون کی اسی کمزور رگ پکڑتے ہوئے میں نے کہا:

"آج شام کو آنے والے مہمان فرانسیسی بھی خوب جانتے اور بولتے ہیں" اور یہ سنتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"پھر تو وہ معزز ہی نہیں بلکہ شریف بھی ہوں گے" خوش ہو کر اس نے کہا "اور وہ تمھارے نہیں بلکہ میرے مہمان ہوں گے۔"

"وہ ہیں بھی تمھارے ہی سن کے۔"

"تم بہت شوخ ہوتے جا رہے ہو" میرے جملے سے لطف لیتے ہوئے بوڑھی خاتون نے کہا "کاش تم بھی فرانسیسی جانتے۔"

ٹھیک ساڑھے چار بجے مہاراج سنگھ کو ساتھ لے کر اپنی قیام گاہ

پہنچا۔ گھنٹی بجانے کے بعد دروازہ کھلا تو بوڑھی خاتون نرالی سج دھج سے بالکل 'مادام' بنی سامنے کھڑی تھیں۔ مخصوص فرانسیسی انداز میں انھوں نے مہمان کا استقبال کیا۔ اور کچھ دیر دونوں ایک دوسرے میں گم رہے۔ اس عرصے میں چائے کی میز کا میں نے جائزہ لیا، جو ضرورت سے زیادہ پُر تھی۔ پھر ریڈیو کا سوئچ گھما کر سوئی آل انڈیا ریڈیو کے میٹر بینڈ پر لگا دی۔ پانچ بجنے میں ابھی دس بارہ منٹ باقی تھے۔ ایک مغنیہ آتش نوا غالب کی غزل گا رہی تھی:

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو
غلط ہے جذب دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے!
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

گانے والی مقطع پر پہنچی تو پانچ بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔

اس نے مطلع دہرایا جو پہلے ہمارے حصے میں نہیں آیا تھا:

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو

نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

"غالب کا بھی جواب نہیں ہے" مہاراج سنگھ نے کہا جو ہر ہر شعر پر سر دھن رہے تھے "یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ اب تک غالب کو یورپ سے روشناس نہیں کیا جاسکا!"

"آپ نے شاید اس پہلو پر غور نہیں کیا" میں نے کہا "ہماری ملک کی موجودہ صورتِ حال، لارڈ ویول کی تقریر، جسے سننے کے انتظار میں ہم بیٹھے ہیں اور اِس غزل میں بڑا قریبی ربط ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"مجھے تو ہر شعر کانگرس اور مسلم لیگ کا ڈائیلوگ معلوم ہوتا تھا اور اسی کے بارے میں لارڈ ویول تقریر کرنے والے ہیں اور مقطع تو بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ لارڈ ویول مسٹر جناح سے کہہ رہے ہیں:

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب

ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اور ——"

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ ویول کی تقریر شروع ہو گئی:

Dialogue ڈائیلوگ

"ہندستان کے سفر آزادی کی ایک اہم منزل کی طرف آج قدم بڑھایا جارہا ہے۔" لارڈ ویول نے عارضی حکومت[1] کے قیام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "چودہ میں سے پانچ نشستیں مسلم لیگ کو پیش کی گئیں، اور مسلم لیگ کو یہ بھی یقین دلایا گیا کہ دستور بنانے کا جہاں تک تعلق ہے، معینہ حدود کے اندر ہی کام کیا جائے گا، نیز یہ کہ نئی انٹرم گورنمنٹ موجودہ دستور ہی کے تحت کام کرے گی۔ ان سب یقین دہانیوں کے باوجود فی الحال ملی جلی حکومت نہ بن سکی۔ اس ناکامی کا صدمہ مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں ہو سکتا۔ . . . یہ بات بھی میں صفائی سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ کو جو پیش کش کی گئی ہے اس کے دروازے کھلے رہیں گے . . .

"حصول آزادی کے اس عبوری دور میں بہت زیادہ رواداری کی ضرورت ہوگی . . . صرف سنجیدہ شہریوں ہی سے نہیں بلکہ نوجوانوں سے اور ان سب سے، جو غیر مطمئن ہیں، میں اپیل کرتا ہوں کہ مشتعل کرنے والے الفاظ، یا اشتعال انگیز افعال سے نہ تو انھیں فایدہ پہنچ سکتا ہے، نہ ان کے فرقے یا ہندستان کو . . ."

خبروں کے بلیٹن میں لارڈ ویول کی تقریر کے ضروری حصوں کو قدرتی طور پر زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ اس کے بعد عارضی حکومت

---

[1] Interim Government

کے ممبروں کے نام کا اعلان کیا گیا تھا۔ پہلا نام جواہر لال نہرو کا تھا، اس کے بعد بالترتیب سردار پٹیل، راجندر پرشاد، راج گوپال اچاری، آصف علی، شرت چندر بوس، جان میتھائی، سردار بلدیو سنگھ، شفاعت احمد خاں، جگ جیون رام، سید علی ظہیر اور ڈاکٹر بھابھا کے نام تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتلایا گیا تھا کہ عارضی حکومت کے ممبر ۲ ستمبر کو اپنے عہدے سنبھالیں گے۔

ساڑھے چھ بجے کے قریب ہم شیپرڈس واپس لوٹے، تو اس کا چبوترہ حسب معمول قاہرہ کے خوش باشوں، غیر ملکی سیاحوں اور یورپ امریکا، افریقہ اور ایشیا جانے والے مسافروں سے بھرا تھا، جنھیں ہوائی جہاز بدلنے کے سلسلے میں بالعموم ایک یا دو دن قاہرہ میں ٹھہرنا پڑتا تھا۔

"وہ سر آغا خاں بیٹھے ہیں!" ایک خالی میز پر بیٹھنے کے بعد ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے مہاراج سنگھ سے میں نے سوالیہ انداز میں کہا "یہ کب آئے؟"

"کل رات آئے ہیں" مہاراج سنگھ نے جواب دیا "آج صبح ہم لوگوں کو انھوں نے بہت سی مٹھائی بھیجی تھی، میں جا کر ذرا شکریہ ادا کر آؤں"۔

"ضرور جایئے"۔

"ابھی آتا ہوں، دیر نہیں لگاؤں گا"۔

حسب وعدہ وہ پانچ منٹ میں لوٹ آئے۔

"آؤ، تم بھی چلو" آتے ہی انھوں نے مجھ سے کہا "ہز ہائی نس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جب یہ کہہ کر میں نے اجازت چاہی کہ میرے ساتھ ایک ہندستانی دوست ہیں، تو انھوں نے اصرار کیا کہ انھیں بھی یہیں بلالو۔"

آغا خاں کے جسم پر سفید سلک کی قمیص، سفید شارک اسکن کا سوٹ، سفید موزے اور سفید ہی بوٹ تھے۔ ابھی حال ہی میں اپنی زندگی کی ساٹھویں منزل طے کرکے اکسٹھویں میں انھوں نے قدم رکھے تھے۔ ان کے ماننے والوں نے جو ایشیا و افریقہ کے بہت سے ملکوں میں پھیلے ہیں، ان کی ڈائمنڈ جبلی[1] منائی تھی۔ پوربی افریقہ میں تو انھیں ہیروں میں تولا گیا تھا، اور اس وقت وہیں سے لوٹتے ہوئے دو راتوں کے لیے قاہرہ میں ٹھہرے تھے۔ ان کی فرانسیسی بیگم بھی بغل ہی میں بیٹھی تھیں، جو چار پانچ سال ہوئے فرانس کی ملکۂ حسن منتخب ہوئی تھیں۔ ان کے قد و قامت کا تناسب، ان کے چہرے کا وقار، اور ان کے جسم کا ایک ایک عضو اہل فرانس اور آغا خاں دونوں کی حسن شناسی کی داد دے رہا تھا۔ آغا خاں کے ایک نوعمر بیٹے صدرالدین ان کے قریب ہی بیٹھے تھے، جو غالباً ان کی اطالوی بیوی سے ہیں۔

دیول کی تقریر، عارضی حکومت کے وزیروں کے ناموں، اور کانگرس و مسلم لیگ کے جھگڑوں پر کوئی پون گھنٹے تک وہ باتیں

---

[1] Diamond Jubilee

کرتے رہے۔ اس تمام عرصے میں بیگم آغا خاں بت بنی خاموش بیٹھی رہیں۔ بات چیت میں انھوں نے کوئی حصہ نہ لیا۔

"ویول کی تقریر سنتے وقت مجھے تو ایسا لگتا تھا" میں نے کہا "جیسے آزادی ہمارے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔"

"لیکن اس وقت جب کہ آزادی ہمارے دروازے پر دستک دے رہی ہے" کچھ بجھے ہوئے لہجے میں آغا خاں نے کہا "عارضی حکومت سے مسلم لیگ کا الگ رہنا شگون نیک نہیں ہے۔"

"یہی میرا خیال ہے" مہاراج سنگھ نے آغا خاں کی تائید کی۔

"عارضی حکومت کی ۱۴ میں سے ۵ جگہیں مسلم لیگ کو مل رہی تھیں"۔ دبے لفظوں میں احتجاج کرتے ہوئے میں نے کہا "اور کانگرس اس پر اڑی تھی کہ اپنے حصے کی ۹ جگہوں میں سے ایک نیشنلسٹ مسلمان کو دے۔ اس حساب سے عارضی حکومت کے ۱۴ ممبروں میں ۶ مسلمان ہوتے، یا ان کا تناسب ۴۳ فی صدی ہوتا۔ عارضی حکومت سے مسلم لیگ کا الگ رہنا ملک سے زیادہ مسلمانوں کے حق میں بدشگونی ہے، اور یہ بدشگونی خود مسلم لیگ نے کی ہے۔"

"آپ گھبرائیے نہیں" آغا خاں نے میرے خیالات کو بھانپ کر کہا "کانگرس سے کہیں زیادہ مسلم لیگ کو میں اس کا ذمے دار سمجھتا ہوں۔"

"ابھی یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ زیادہ قصور کس کا ہے" مہاراج سنگھ نے کہا۔

"لیکن کانگرس نے جن مسلمانوں کو عارضی حکومت میں شامل کیا ہے" آغا خاں نے کچھ رک کر کہا "ان میں سے ایک نام پر مجھے سخت اعتراض ہے۔"

"ایک نام پر مجھے بھی اعتراض ہے" میں نے کہا۔

"آپ کو کس نام پر اعتراض ہے؟" آغا خاں نے سوال کیا۔

"سر شفاعت احمد خاں کے نام پر" میں نے جواب دیا "جو ہمیشہ کانگرس کے حریف ہی نہیں بلکہ انگریزوں کے حلیف بھی رہے ہیں۔ اگر کسی غیر کانگرسی مسلمان ہی کو لینا تھا، تو ان سے کہیں بہتر اور مسلمان مل سکتے تھے۔"

"لیکن مجھے تو اعتراض علی ظہیر کے نام پر ہے" اپنے لہجے سے ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے کہا "صرف شیعہ ہونے کی وجہ سے انھیں لیا گیا ہے، اور ایک اہم شیعہ فرقے کا لیڈر ہونے کی حیثیت سے مجھے تو ان کا لیا جانا سخت ناپسند ہے۔"

"یور ہائی نس" علی ظہیر کی وکالت کرتے ہوئے میں نے کہا "علی ظہیر بہرحال کانگرسی ہیں۔ ایک زمانے میں وہ اور سر وزیر حسن بھی مسلم لیگ میں تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ تھے، لیکن ۱۹۳۷ء میں جب مسلم لیگ

کی تاریخ کا نیا دور، یا یوں کہیے کہ جناح صاحب کا عہد شروع ہوا، تو مسلم لیگ کے پہلے تاریخی اجلاس میں جو لکھنؤ ہی میں ہوا تھا، سر وزیر حسن، علی ظہیر اور سیٹھ یعقوب کو بہ یک بینی و دو گوش مسلم لیگ کونسل سے نکال دیا گیا۔ جس دن ان تینوں کو نکالا گیا ہے، اسی دن لکھنؤ ہی کے امین الدولہ پارک میں ایک جلسہ ہوا تھا، جس میں ان تینوں نے اپنے مسلم لیگ سے نکالے جانے پر شدید احتجاج کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تقریر کرتے ہوئے سیٹھ یعقوب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اگر آپ معاف کریں تو میں عرض کر دوں گا کہ علی ظہیر کے نام پر اعتراض کرنے میں شاید آپ حق بہ جانب نہ ہوں گے۔"

"آپ جو بھی کہیے" سر آغا خاں نے اپنے خیال پر اصرار کرتے ہوئے کہا "میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں اس کے خلاف احتجاج کر دوں۔"

"آپ اس کو اگر غلط سمجھتے ہیں" میں نے سنجیدگی سے کہا "تو آپ کو ضرور احتجاج کرنا چاہیے۔"

"ہندستان کی سیاست میں حصہ لینا میں نے چھوڑ دیا ہے" انھوں نے رک رک کر کہا "اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مولانا آزاد کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟"

"وہ خود اس کے لیے تیار نہ ہوئے ہوں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر آپ کا خیال صحیح ہے" آغا خاں نے کہا "تو انھوں نے

غلطی کی ہے۔"

ہندستانی مسائل کے علاوہ اسلام، کمیونزم، مصر کی اسلامی زندگی، اور عالمِ اسلام کے مذہبی رجحانات کے بارے میں سر آغا خاں باتیں کرتے رہے۔ یہ تھی میری ان کی پہلی ملاقات، ان کی باتیں مجھے بہت دل چسپ معلوم ہوئیں۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ جتنے وجیہ تھے، ان کا لہجہ اور ان کا اندازِ بیان بھی اسی قدر پروقار تھا۔ باتیں انھوں نے بڑے انہماک سے کیں اور یہ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ پون گھنٹے کی ملاقات میں ہم دونوں سے یہ پوچھنے کا بھی انھیں خیال نہ آیا کہ ہمارے لیے بھی کچھ منگایا جائے، اگرچہ اس عرصے میں انھوں نے خود اپنے لیے تین بار سوڈا منگایا۔

قاہرہ میں نہرو جناح کی ایک شام

"یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔ اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں ـــ"

یہ قصہ ۲۸ نومبر ۱۹۴۶ء کی ایک شام کا ہے۔ مصر کی گھڑیوں میں اُس وقت پورے ساڑھے پانچ بجے تھے۔ اس شام کو آل انڈیا ریڈیو نے پہلی خبر یہ سنائی کہ دسمبر کی ابتدائی تاریخوں میں ہندستانی لیڈروں کی ایک کانفرنس لندن میں ہوگی، جس میں عبوری حکومت کے وزیرِاعظم جواہر لال نہرو، نائب وزیرِاعظم لیاقت علی خاں اور وزیرِ دفاع سردار بلدیو سنگھ کے علاوہ مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ محمد علی جناح اور وایسرائے لارڈ ویول بھی حصہ لیں گے۔ اسی سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو نے یہ بھی بتایا کہ ہندستانی لیڈروں کا یہ مختصر

قاہرہ میں نہرو جناح کی ایک شام

سا قافلہ یکم دسمبر کی صبح کو نئی دہلی سے روانہ ہوگا اور رات کو قاہرہ میں قیام کرے گا۔

اس خبر کا پہلا حصہ غیر متوقع نہیں تھا۔ اخباری حلقوں میں کئی دن سے اس کانفرنس کے امکان کی خبریں گشت کر رہی تھیں۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ ہندستان کی عبوری حکومت کے قیام کا، مسلم لیگ کی توقع کے خلاف، جب فیصلہ ہوگیا تو مسلم لیگ نے اسے اپنی شکست سمجھا اور اس کے غم و غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیوں کہ لیگ کو یہ خوش فہمی تھی کہ اس کی شرکت اور مرضی کے بغیر عبوری حکومت کا قیام ممکن نہ ہوگا۔ چناں چہ مسلم لیگ کا ڈائرکٹ ایکشن اسی ناکامی و مایوسی کی پیداوار تھا۔ اس کا انتہائی بھیانک مظہر کلکتے کا قتل عام تھا، جس کا مقصد عبوری حکومت کے قیام کی راہیں روکنا تھا، لیکن اس کے باوجود عبوری حکومت ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو وجود میں آگئی۔ مگر کلکتے کے قتل عام نے لارڈ ویول کے دل و دماغ کو یقیناً ماؤف کر دیا، جو سیاسی داؤں پیچ سے نا آشنا سیدھے سادھے سپاہی تھے۔ چناں چہ انھوں نے عارضی حکومت کے قیام کے چند ہفتوں کے بعد مسلم لیگ کو پھسلا کر حکومت میں شامل کر لیا۔

لارڈ ویول کو خیال تھا کہ مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شامل کر کے انھوں نے ہندستان کی سب سے بڑی سیاسی گتھی کو سلجھا لیا ہے، لیکن ان کے اس اقدام نے صورت حال کو نازک تر بنا دیا۔ اسی سے عہدہ برا ہونے کے لیے برطانوی لیبر حکومت نے ہندوستانی لیڈروں کو لندن آنے کی دعوت دی تھی۔

قاہرہ کا شیپرڈس ہوٹل، جو شام کو حقیقی معنوں میں، مصر کا بازار بن جاتا ہے، ۲۸ر نومبر کی شام کو اس کا چبوترہ حسب معمول کھچا کھچ بھرا تھا۔ درمیانی حصے میں چند ہندستانی بھی ایک میز کے گرد بیٹھے اپنے لیڈروں کی آمد کی خبر اور اس کے استقبالیہ پہلو پر بڑی گرم جوشی سے باتیں کر رہے تھے۔

شیپرڈس کے اس چبوترے پر، جہاں ہم بیٹھے تھے، ہندستانیوں کی تعداد رفتہ رفتہ پندرہ بیس تک پہنچ گئی۔ کچھ مصری وغیر مصری اخبار نویس اور کچھ ہندستان دوست مصری بھی اس گروہ میں آملے۔ اخبار نویسوں کو تو اس خبر کے سیاسی پہلو ہی سے دل چسپی تھی اور لندن کانفرنس کے متوقع نتائج ہی کو سمجھنا چاہتے تھے، لیکن ہندستانیوں اور غیر اخبار نویس مصریوں کے لیے اس خبر کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ ہندستانی لیڈر ایک رات کے لیے فراعنہ کے تاریخی شہر اور قلوپترا کے رومانی نگر میں رین بسیرا کریں گے۔ اس خیال نے سب پر سرخوشی و سرمستی کی سی کیفیت طاری کردی تھی۔ شیپرڈس کا یہ گوشہ جہاں ہم سب اکٹھا ہو گئے تھے، اچھا خاصا تماشا گاہ سا بن گیا تھا۔ اب عافیت اسی میں نظر آئی کہ یہ مجمع ہوٹل کے اس اندرونی حصے میں منتقل ہو جائے، جہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی، اور جو اسی نوع کے ہنگاموں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ ہمارے اس جھنڈ میں رندان بلا نوش بھی تھے اور زاہدان شب زندہ دار بھی۔ سب نے، ظرف کے مطابق، اپنے کام و دہن کی ضیافت کی۔

کسی نے آب نشاط انگیز سے اور کسی نے آب سادہ سے۔

"میں تم کو دیر سے ڈھونڈھ رہی ہوں" ایک خاتون نے پیچھے سے میرے کاندھوں کو دباتے ہوئے کہا "پہلی دسمبر کو نہرو قاہرہ آرہے ہیں"۔

یہ ایک لبنانی اخبار نویس خاتون تھیں۔ بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی۔ اور ابھی کچھ ہی عرصے پہلے امریکا ہی سے جرنلزم کی ڈگری لے کر آئی تھیں۔ کئی عرب روزناموں کی اور یورپ و امریکا کے کئی اخباروں کی نامہ نگار تھیں۔ ہندستانی مسایل سے انھیں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ ڈاکٹر سید حسین کا بہت ذکر کیا کرتی تھیں، جن کے لکچر انھوں نے امریکا ہی میں سنے تھے اور جوان کے ایک استاد کے قریبی دوست تھے۔

"آج بہت حسین معلوم ہو رہی ہو تم" اپنے کاندھوں کو ان کی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے میں نے کہا۔

"دیکھو خدا کے لیے دھوکا نہ دینا" میرے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے تحکم اور التجا کے ملے جلے لہجے میں کہا "نہرو سے مجھے ضرور ملانا۔ واللہ ان سے مجھے محبت ہے، عشق ہے"۔

"بڑی بے شرم ہو تم" ایک دوست نے چٹکی لی "مشرقی عورتیں سر بازار عشق کا اظہار نہیں کرتیں"۔

"بے وقوف ہو تم" انھوں نے جواب دیا "ان نازک معاملات کو تم سمجھ ہی نہیں سکتے"۔

یہ تھی بڑی قیامت کی شام ـــ جیسے لوگوں کو نئے سال کے درود کا

انتظار ہو۔ رات گئے ایمک ناٹے دنوشس کا سلسلہ جاری رہا۔ دو بجے کے قریب گھر پہنچا تو تن بدن کی سدھ نہیں تھی۔ کسی نہ کسی طرح کپڑے اتار کر بستر پر گر گیا۔

"دو بار ٹیلیفون آچکا ہے عزام پاشا کے سکریٹری کا" میری بوڑھی لینڈ لیڈی نے سوا نو بجے جھنجھوڑ کر جگاتے ہوئے کہا "میں نے تو پہلی ہی بار کہہ دیا تھا کہ طبیعت خراب ہے۔ سو رہے ہیں۔ لیکن پھر ابھی ٹیلیفون آگیا"۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم پر سچ بولنے کا دورہ نہیں پڑا" کروٹ بدلتے ہوئے میں نے کہا۔

"سچ کیسے بولتی" خاتون نے ملامت آمیز لہجے میں کہا "تمھاری ملازمت کی تم سے زیادہ مجھے فکر رہتی ہے"۔

ملازمت کی بات سنتے ہی گڑبڑا کر میں اٹھا اور سیدھا غسل خانے کا رخ کیا۔ بیس پچیس منٹ کے بعد نہا دھو کر غسل خانے سے نکلا تو کپڑوں کے ساتھ ناشتہ بھی بستر سے لگی ہوئی چھوٹی سی میز پر لگا رکھا تھا۔ اُلٹا سیدھا ناشتہ کیا اور جلدی جلدی کپڑے بدل کر عزام پاشا کے گھر پہنچا، جو میری قیام گاہ سے متصل ہی تھا۔

"آج کا اخبار پڑھا؟" صاحب سلامت کے بعد عزام پاشا نے سوالیہ لہجے میں کہا "نہرو اور جناح کل یہاں آرہے ہیں"۔

"کل نہیں، پرسوں آرہے ہیں" میں نے جواب دیا "یہ خبر مجھے رات ہی مل گئی تھی"۔

"مجھے یہ فکر ہے" عزام پاشا نے پر تشویش لہجے میں کہا " ان لوگوں سے اگر ملاقات ہوئی تو کان فرنس کے بارے میں دونوں سوال کریں گے۔"

"یہ بات تو میرے ذہن میں بھی ہے" میں نے جواب دیا "لیکن آپ سے ان لوگوں کی ملاقات کا کوئی امکان معلوم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ڈاکٹروں نے آپ کو مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ بلکہ سختی سے ہدایت کی ہے۔"

"کان فرنس کے بارے میں کیا کیا جائے؟"

عزام پاشا کا اشارہ ایشیا کے آزاد، نیم آزاد و نو آزاد ملکوں کی اس پہلی کان فرنس کی طرف تھا جو مارچ ۱۹۴۷ء میں، نئی دہلی میں منعقد ہونے والی تھی۔ یہ اگرچہ ایک غیر سرکاری کان فرنس تھی، جس کی استقبالیہ کمیٹی کی صدر مسز سروجنی نائیڈو تھیں، لیکن اس کے محرک اور روح رواں چوں کہ ہندستان کی عارضی حکومت کے سربراہ جواہرلال نہرو تھے، اس لیے اس کی حیثیت اگر سرکاری نہیں تو نیم سرکاری سی ہو گئی تھی۔ اس کان فرنس کی کامیابی کے بعد ایشیا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں ہندستان کی عارضی حکومت اور جواہرلال نہرو دونوں کے وقار کے بلند ہو جانے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ اسی کے پیش نظر مسلم لیگ اس کی مخالف تھی اور اس کی کوشش تھی کہ کم از کم عرب ممالک اس میں شریک نہ ہوں۔

عرب لیگ کے نام اس کان فرنس کا دعوت نامہ جب آیا تو

پوری صورت حال عزام پاشا کے سامنے پیش کرتے ہوئے خود میں نے کوئی رائے نہیں دی۔ آج بھی جب انھوں نے سوال کیا تو میں اپنا دامن بچا گیا۔

"آپ کے فیصلے پر اثر انداز ہونا میرے لیے مناسب نہیں ہے" میں نے جواب دیا۔

"میری رائے تو یہ ہے" فیصلہ کن انداز میں انھوں نے کہا "آج ہی کیبل بھیج دیا جائے کہ عرب لیگ کان فرنس میں شریک ہوگی۔ مسٹر جناح نے اگر سوال کیا تو کہہ دوں گا کہ عرب لیگ تو دعوت نامہ قبول کر چکی ہے۔ اب رد کرنا مناسب نہ ہوگا"۔

عزام پاشا کے اس دوٹوک فیصلے نے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا۔ میں نے اپنے انداز کے پیش نظر مسز نائیڈو کو یقین دلایا تھا کہ عرب لیگ کان فرنس کے دعوت نامے کو قبول کرے گی۔ اس لیے عزام پاشا کے فیصلے سے مجھے حد درجہ خوشی ہوئی، اگرچہ جلد ہی اس کامیابی کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی اور ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔

"ہندستانی لیڈروں کے استقبال کے لیے عرب لیگ کا رئیس التشریفات (چیف آف پروٹوکول) ائرپورٹ جائے گا۔" جب میں رخصت ہونے لگا تو عزام پاشا نے کہا۔

"اچھا ہوتا تو میں خود بھی جاتا۔ نہرو اور جناح سے آپ بھی میری طرف سے معذرت کر دیجیے گا۔"

قاہرہ میں نہرو جناح کی ایک شام

پہلی دسمبر کی شام کو، پانچ بجے کے لگ بھگ، رایل انڈین ایر فورس کا ایک بڑا سا جہاز قاہرہ کے سیول ایر پورٹ المازہ پر اترا، تو مصری حکومت، عرب لیگ اور برطانوی سفارت خانے کے نمایندوں، مصری اور غیر مصری اخبار نویسوں کے علاوہ مصر کی ساری ہندستانی آبادی بھی وہاں سمٹ آئی تھی۔

برطانوی سفارت خانے کی ہدایت کے مطابق مصری حکومت نے سکیورٹی کا خاص طور سے اہتمام کیا تھا، اور سفارت خانے ہی نے سرکاری نمایندوں اور اخبار نویسوں کے علاوہ انڈین یونین کے عہدے داروں ہی کو ہوائی جہاز کے قریب جاکر ہندستانی لیڈروں کے استقبال کی اجازت دی تھی۔

سب سے پہلے لارڈ ویول ہوائی جہاز سے نکلے۔ دوسرا نمبر جواہر لال نہرو کا تھا، جو عبوری حکومت کے سربراہ تھے، لارڈ ویول سے تو کسی نے تعرض نہ کیا اور وہ ایک طرف جاکر کھڑے ہو گئے۔ لیکن جواہر لال نہرو کو دیکھتے ہی ہندستانی مجمع سکیورٹی کے بندھنوں کو توڑ کر "ہندستان زندہ باد" اور "جواہر لال نہرو کی جے" کے نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھا، اور جہاز کے زینے ہی پر انھیں اس طرح گھیر لیا کہ دوسروں کے نکلنے کا راستہ ہی نہ رہا۔

تیسرے نمبر پر وزیر خزانہ لیاقت علی خاں نکلے جن کا عبوری حکومت میں جواہر لال نہرو کے بعد دوسرا نمبر تھا۔ ان کے بعد وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ کا نمبر آیا۔ جناح صاحب

اگرچہ مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ تھے مگر ان کی کوئی سرکاری حیثیت نہ تھی، اس لیے جہاز سے باہر آنے والوں میں ان کا پانچواں نمبر تھا۔ لیاقت علی خاں اور سردار بلدیو سنگھ تو موٹے تازے تھے لوگوں کو دھکے دیتے ہوئے لارڈ ویول کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ جناح صاحب دبلے پتلے اور کمزور انسان تھے مجمع میں زیر و زبر ہونا بھی ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ چوتھی سیڑھی پر کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔

سارا مجمع جواہر لال کو دیکھ کر ایسا مگن ہوا کہ جناح صاحب کا کسی کو خیال ہی نہ رہا۔ چند منٹ تک تو جواہر لال نہرو بھی ہندستانیوں کے جھرمٹ اور پھولوں اور ہاروں کے طوفان میں گھرے رہے، پھر ان ہی کو یکایک خیال آیا کہ جناح صاحب کو کوئی نہیں پوچھ رہا ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں بپھر کر سوال کیا۔

"جناح صاحب کہاں ہیں؟ جناح صاحب کہاں ہیں؟"

"پیچھے سیڑھی پر کھڑے ہیں ——" ایک ہندستانی خاتون نے جواب دیا۔

مجمع کو چیرتے پھاڑتے جواہر لال نہرو خود سیڑھی پر چڑھے، اور جناح صاحب کا ہاتھ پکڑ کر نیچے لائے۔ ایک ہندستانی خاتون ہاتھ میں ہار لیے کھڑی تھی۔ انھوں نے جھپٹ کر خاتون کے ہاتھ سے ہار لیا اور جناح صاحب کے گلے میں ڈال دیا۔ پھر تو جتنے بھی ہار وہاں تھے سب اُن کی گردن میں پڑ گئے، جو چپ

ساد ھے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر نام کو بھی مسکراہٹ نہیں تھی۔ ان کے تیور سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس اتفاقی فردِ گزاشت کا ان پر گہرا اثر ہوا ہے۔

"یہ ہیں ترلوک سنگھ، اور یہ ہیں متھائی" دو نوجوانوں کو مجھ سے ملاتے ہوئے جواہر لال جی نے کہا "کسٹم سے ہمارا سامان نکلوانے میں مہربانی کرکے ان کی مدد کرو۔"

جواہر لال جی کی یہ ہدایت غیر ضروری ثابت ہوئی کیوں کہ کسٹم والوں نے اس پارٹی کے کسی بھی آدمی کا سامان نہیں دیکھا، لیکن ان کے اس درخواست نما حکم کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں سب سے آخر میں شیپرڈس پہنچا، جہاں ہندستانی لیڈروں کو نو دس گھنٹے قیام کرنا تھا۔

شیپرڈس پہنچنے کے بعد ہوٹل کے گائیڈ نے ہندستان کے وزیر اعظم کے کمرے کا جو نمبر مجھے بتایا۔ اس کے دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوا، تو جناح صاحب ایک کرسی پر نیم دراز تھے۔ اب واپس لوٹنا نامناسب تھا۔ سلام کرکے میں نے اپنا تعارف کرایا۔ بڑے تپاک سے ہاتھ ملاتے ہوئے انھوں نے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"دہلی سے قاہرہ تک کا سفر کیسا رہا؟" مزاج پرسی کے بعد میں نے سوال کیا۔

"بہت اچھا رہا" جناح صاحب نے جواب دیا "لیکن ریگستان دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں۔"

"گرمی کے موسم میں تو یہ منظر اور بھی آنکھوں کو برا لگتا ہے۔" میں نے ان کی تائید کی۔

"تم یہاں کیا کرتے ہو میرے بچے!" جناح صاحب نے مشفقانہ لہجے میں سوال کیا۔

"میں عرب لیگ میں ملازم ہوں۔"

"یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کیا کام ہے تمھارے ذمے؟"

"ہندستانی مسائل کا شعبہ" جواب دیتے ہوئے میں نے کہا "اس وقت دو باتوں کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

"ہاں کہو۔"

"ایک تو یہ کہ ایرپورٹ پر جو اتفاقی فروگذاشت ہوئی، اس کی آپ سے معافی مانگوں۔"

"تم کس حیثیت سے معافی مانگنے آئے ہو؟"

"یہاں ہندستانیوں کی ایک انجمن ہے۔ انڈین یونین" میں نے جواب دیا "اس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے۔"

"ہندستانیوں کی؟"

"جی ہاں ہندستانیوں کی۔"

"ہندستانی مسلمانوں کی کوئی انجمن یہاں نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔"

"تمھاری کوئی انجمن اگر یہاں ہوتی تو اس وقت معذرت کرنے کی تمھیں ضرورت پیش نہ آتی۔ کیوں ہے نا یہی بات" چند منٹ تک کمرے میں سکوت رہا۔ جناح صاحب شاید جواب کے منتظر تھے۔ لیکن کچھ کہنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ پھر جناح صاحب ہی نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

"اور دوسری بات تم کیا کہنا چاہتے تھے؟"

"قاہرہ میں رہنے والے سب ہندستانیوں کی خواہش ہے کہ ہمارے لیڈر جو خوش قسمتی سے آج یہاں آئے ہیں چند منٹ کے لیے انڈین یونین کے جلسے میں تشریف لائیں، اور اس کے لیے پہلے آپ ہی سے درخواست کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے" جناح صاحب نے نرم مگر فیصلہ کن لہجے میں فرمایا "میں نہ جاسکوں گا، میں تھکا ہوا ہوں، اور میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ دروازے پر دستک دیکر کوئی اندر داخل ہوا اور موقع غنیمت جان کر میں نے اجازت لی۔

"پھر ملنا" انھوں نے ہاتھ ملاتے ہوئے خلوص سے تاکید کی "بھولنا نہیں، ضرور ملنا۔"

"میں ضرور حاضر ہوں گا۔"

جناح صاحب کے کمرے سے نکلنے کے بعد دوسرا کمرہ جو مجھے بتایا گیا، لیاقت علی خاں کا نکلا۔ وہ ایک بڑے سے صوفے پر لیٹے تھے۔ ان کے قریب کرنال ہی کے ایک صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے، جو ان ہی سے ملنے سویز سے آئے تھے۔ صاحب سلامت اور رسمی گفتگو کے بعد ان سے بھی میں نے اجازت لی۔

اب کی بار جس کمرے کا نمبر مجھے بتایا گیا وہ جواہر لال نہرو ہی کا کمرہ تھا۔ اس کے دروازے کھلے تھے۔ باتوں کی اور اس سے

زیادہ قہقہوں کی آوازیں دور ہی سے سنائی دے رہی تھیں۔ کمرے میں داخل ہوا تو چائے کا دور چل رہا تھا، اور جواہر لال جی قاہرہ کے ہندستانیوں میں گھرے بیٹھے تھے۔

"کہاں رہ گئے تھے؟" جواہر لال جی نے دیکھتے ہی سوال کیا
"ترلوک سنگھ اور متھائی تو دیر سے آ گئے تھے۔"

"جناح صاحب اور لیاقت علی خاں کو سلام کرتا ہوا آ رہا ہوں" میں نے جواب دیا، اور ساتھ ہی مختصر روداد بھی سنا دی۔
"ساڑھے سات بجے نحاس پاشا کے یہاں آپ کو جانا ہے" ترلوک سنگھ نے جواہر لال جی کو یاد دلایا "اب کچھ دیر آپ آرام کرلیں۔" یہ سنتے ہی مجمع خود بخود برخاست ہو گیا۔ اس وقت پورے چھ بجے تھے۔

"آدھے گھنٹے کے بعد مجھ سے مل لو تو اچھا ہے" سب کو رخصت کرتے ہوئے، جواہر لال جی نے مجھ سے کہا "دو ایک ضروری باتیں پوچھنی ہیں۔"

یہ مجمع شیپرڈس کی چوتھی منزل سے اتر کر اب اس جانے پہچانے چبوترے پر آ گیا، جو حسبِ معمول روشن اور کھچا کھچ بھرا تھا۔ بہت سے ہندستانی بھی وہاں تھے، جنھیں اوپر جانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ ان ہی میں سے کچھ لوگ اپنے ان ہندستانی بھائیوں کو جلسے کی اطلاع دینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے، جو ہوائی اڈے ہی سے واپس چلے گئے تھے۔ اخبار نویس دوستوں کو بھی جو اس وقت وہاں موجود تھے، ہم نے اطلاع دی۔ ان ہی میں عرب

اخبار نویس خاتون بھی تھیں جو اس دعوت عام سے خوش نہ ہوئیں، اور منھ پھلا کر ایک طرف بیٹھ گئیں۔

"ساڑھے چھ بج چکے ہیں" فاروقی صاحب نے مجھے یاد دلایا "تمھیں کہیں جانا تھا" یہ سنتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اخبار نویس خاتون نے سوال کیا۔

"جواہر لال نہرو کے کمرے میں"۔

"میں بھی چلوں؟" بڑی لجاجت سے خاتون نے سوال کیا۔

"اچھا آؤ" کچھ تامل کے ساتھ میں نے جواب دیا۔

اوپر پہنچا تو جواہر لال جی کے کمرے کا دروازہ اس بار کھلا نہیں تھا۔ میں نے کواڑ تھپ تھپائے۔

"آجاؤ" اندر سے آواز آئی۔

"ابھی اندر نہ آنا" خاتون کو میں نے ہدایت کی "اجازت لے کر میں بلا لوں گا"۔

کمرے میں داخل ہوا تو جواہر لال جی کپڑے بدل کر بالکل تیار بیٹھے تھے۔

"یہ کون ہیں تمھارے ساتھ؟" انھوں نے سوال کیا۔

گھوم کر دیکھا تو خاتون میرے پیچھے کھڑی جواہر لال جی کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی صورت دیکھ کر غالب کا یہ شعر بے اختیار یاد آگیا جو میں نے سنا بھی دیا۔

"تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں"

"یہ ہیں کون؟" جواہر لال جی نے سوال کیا۔

"ایک لبنانی اخبار نویس خاتون ہیں" میں نے جواب دیا "جو آپ کے عشق کا دم بھرتی ہیں!"

"میرے، یا تمھارے؟" انھوں نے بے ساختہ سوال کیا۔

"نام تو یہ آپ ہی کا لیتی ہیں" ساتھ ہی میں نے وہ باتیں بھی سنا دیں، جو دو رات پہلے خاتون نے کی تھیں۔

جواہر لال جی نے آگے بڑھ کر خاتون سے ہاتھ ملایا، اور اپنے قریب ہی صوفے پر بٹھا لیا۔ پھر وہ سب باتیں انھوں نے خاتون کو انگریزی میں سنائیں جو میں نے اردو میں کہی تھیں، جنھیں سن کر وہ بہت شرمائیں۔

"اگر آپ اجازت دیں" جواہر لال جی نے رسمی گفتگو کے بعد خاتون سے کہا "تو چند ضروری باتیں ان سے کر لوں پھر آپ سے باتیں کروں گا۔"

"عرب لیگ نے ایشیائی کانفرنس کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا؟" انھوں نے مجھ سے سوال کیا "مسز نائیڈو بہت پریشان ہیں۔ کیوں کہ عرب لیگ ہی کے فیصلے پر عرب ملکوں کی شرکت کا بہت حد تک انحصار ہے۔"

اس کے جواب میں عزام پاشا کا فیصلہ اور ان کی گفتگو میں نے مختصراً سنا دی۔

"یہ اچھی خبر سنائی تم نے" اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے پوچھا "تو کیبل بھیج دیا گیا؟"

"جی ہاں"۔

"عزام پاشا سے میں کبھی ملا نہیں ہوں" جواہر لال جی نے کہا "تمھاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاصے سمجھ دار اور سیاسی داؤ پیچ سے واقف ہیں"۔

"آپ کا خیال صحیح ہے" میں نے جواب دیا "بنیادی طور پر وہ قوم پرست ہیں۔ ان کے دماغ کو سوشلزم سے بھی کچھ ربط معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک سیاسی داؤں پیچ سے واقف ہونے کا تعلق ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عرب ملکوں میں آج وہی ایک ایسے آدمی ہیں جن کو عرب عوام اور عرب حکمرانوں کا یکساں اعتماد حاصل ہے"۔

"کچھ زیادہ بیمار ہیں؟" انھوں نے مزید سوال کرتے ہوئے کہا "ان سے نہ مل سکنے کا مجھے افسوس ہے۔ میری طرف سے مزاج پرسی کرنا، اور کانفرنس میں شرکت کے فیصلے کے لیے ان کا شکریہ بھی ادا کر دینا۔ اچھا اب کچھ دیر میں تمھاری دوست سے باتیں کر لوں۔ پھر تم سے دو ایک باتیں اور پوچھوں گا"۔

اب وہ عرب خاتون کی طرف مخاطب ہوئے۔ اور ہندستان کی سیاسی صورت حال کے متعلق ان کے سوالوں کا جواب دیتے رہے۔

"آپ کے اور جناح صاحب کے ذاتی تعلقات بھی کیا اتنے ہی کشیدہ ہیں، جتنے سیاسی؟" خاتون نے سوال کیا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ ہمارے نجی تعلقات بہت اچھے ہیں عمر میں وہ مجھ سے بڑے ہیں، اور میرے باپ کے وہ گہرے دوست تھے۔ میں ان کی عزت کرتا ہوں۔ انھیں اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔"

"کبھی آپ لوگ ایک دوسرے سے ملتے بھی ہیں؟"

"ہماری سیاسی ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں، اور سماجی بھی۔"

"آزادی کے بنیادی مطالبے پر تو کانگرس اور مسلم لیگ دونوں متفق ہیں" خاتون نے سوال کیا "تو پھر دونوں پارٹیوں کے اختلافات کی نوعیت کیا ہے؟"

"اس بنیادی مطالبے پر اتفاق کے باوجود دونوں پارٹیوں کی ساخت اور ان کے مزاج میں وہی فرق ہے، جو انیسویں اور بیسویں صدی کی تاریخ میں ہے۔"

"آپ اجازت دیں تو چند باتیں میں بھی کرلوں" میں نے خاتون سے درخواست کرتے ہوئے کہا "انھیں ابھی نحاس پاشا کے یہاں جانا ہے، اور پھر شاید مجھے ان سے باتیں کرنے کا موقع نہ مل سکے گا۔"

"ہاں! ہاں! ضرور" خاتون نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "میرے یہاں بیٹھنے پر تو شاید آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے؟" جواہر لال جی کو میں نے یاد دلایا۔

"ہاں یہ بتاؤ یہاں کی سیاسی فضا کس حد تک ہندستان کے موافق ہے؟"

"میرا تجربہ تو یہ ہے کہ ہندستان کے بہت موافق ہے اور ہندستان کے لیے خیر سگالی کا بھی یہاں بہت بڑا خزانہ ہے۔ تعلیم یافتہ مصریوں پر عموماً اور مصری جنتا پر خصوصاً وفد پارٹی کا آج بھی بے حد اثر ہے، اور وفد کی ہمدردیاں ہمیشہ کانگرس کے ساتھ رہی ہیں۔"

"اور اخوان المسلمین کی یہاں کیا حیثیت ہے؟"

"اس کی ہمدردیاں مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ ایک زمانے میں شاہ فاروق نے وفد کے مقابلے میں اخوان المسلمین کو کھڑا کیا تھا، لیکن جب اس کا اقتدار بڑھا تو شاہ فاروق کو خود اپنا مفاد بھی خطرے میں نظر آیا۔ چناں چہ اب مصری حکومت بھی اخوان کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی، لیکن اس کا اثر و رسوخ اب دوسرے عرب ملکوں میں بھی پھیلنے لگا ہے۔"

"خود شاہ فاروق کی مقبولیت کا کیا حال ہے؟"

"ہر شخص یہاں ان سے نفرت کرتا ہے۔"

"کیوں؟" جواہر لال جی نے سوال کرتے ہوئے کہا "پندرہ بیس برس پہلے جب میں یہاں آیا تھا، اس وقت تو لوگ انھیں بہت پسند کرتے تھے۔"

"ہاں! ایک زمانے میں وہ مصریوں کی آنکھ کا تارا تھے،

لیکن پندرہ بیس برسوں میں نہ جانے کتنی بار نیل میں طغیانی آئی، جو فاروق کا وقار بھی اپنے ساتھ بہالے گئی۔ آج مصر میں ان سے بڑا شرابی، ان سے بڑا جواری اور ان سے بڑا عیاش اور کوئی نہیں ہے۔ ان سب میدانوں میں وہ آپ اپنا جواب ہیں۔ آج ان کی حکومت صرف برطانوی ٹینکوں کے بل بوتے پر قائم ہے۔ یہاں کسی وقت بھی انقلاب آسکتا ہے۔"

اب سات بج چکے تھے اور ساڑھے سات بجے جواہر لال جی کو نحاس پاشا سے ملنا تھا۔

"مصر کے ساتھ ہمارے سفارتی تعلقات قائم ہونے کا کب تک امکان ہے؟" کھڑے ہوتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"آصف علی امریکا جاتے ہوئے تین چار دن یہاں ٹھہریں گے اور وہ اس سلسلے میں بات چیت کریں گے۔"

عرب خاتون نے رخصت ہوتے وقت اپنا وزیٹنگ کارڈ جواہر لال جی کے سامنے رکھتے ہوئے بڑی معصومیت سے درخواست کی:

"مہربانی کرکے اس پر عربی میں اپنا آٹوگراف دے دیجیے۔"

خاتون کی غیر متوقع درخواست پر جواہر لال جی کچھ گھبرائے۔

"اردو میں تو آپ دستخط کر ہی سکتے ہیں" ان کی گھبراہٹ کو بھانپ کر میں نے اردو ہی میں انھیں یاد دلایا۔

"ہاں یقیناً کر سکتا ہوں" میری بات کا انھوں نے انگریزی میں جواب دیا۔ لیکن خاتون سمجھیں کہ یہ ان کی درخواست

کا جواب ہے۔

"شکریہ"۔ بہت خوش ہو کر خاتون نے کہا۔

جواہر لال جی نے کارڈ پر اردو میں اپنا نام لکھ کر خاتون کی طرف بڑھا دیا۔ اردو کا بگڑا ہوا خط خود بخود عربی بن جاتا ہے۔ جواہر لال جی کا یہ "عربی" آٹوگراف دیکھ کر خاتون بہت خوش ہوئیں، اور دیر تک عقیدت مندی کے ساتھ انھیں تکتی رہیں۔

خاتون نے دوسرے دن مجھے بتایا کہ جواہر لال جی سے رخصت ہونے کے بعد انھوں نے جناح صاحب کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور رخصت ہوتے وقت جناح صاحب سے بھی انھوں نے عربی میں آٹوگراف کی درخواست کی۔

"عربی میں؟" جناح صاحب نے حیرت سے سوال کیا "عربی میرے لیے لاطینی و یونانی ہے۔"

"عربی آپ بالکل نہیں جانتے؟" خاتون نے حیرانی سے سوال کیا۔

"نہیں عربی میں بالکل نہیں جانتا۔"

اس جواب کے ساتھ ہی انھوں نے انگریزی میں ام، اے جناح لکھ دیا۔

"یہ جواب سن کر اور انگریزی میں ان کا آٹوگراف دیکھ کر" خاتون نے مجھ سے بیان کیا "میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے ان کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ اس کے پرزے پرزے کرکے ان کے منہ پر مار دوں۔ نہرو

بھی انگریزی ہی میں آٹو گراف دیتے تو شاید مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔"

جواہرلال جی ملک کے کمرے سے نکل کر ہوٹل کے چبوترے تک پہنچا ہی تھا کہ عرب لیگ کے رئیس التشریفات عادل ثابت نظر آئے۔

"آدھے گھنٹے سے میں تمھاری تلاش میں ہوں" عادل نے پریشانی کے لہجے میں کہا۔

"کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ عزام پاشا نہرو اور جناح سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن دونوں سے ایک ساتھ۔ اور مجھیں اس کا انتظام کرنا ہے۔"

یہ سن کر مجھے خوشی تو ہوئی، لیکن مجھے ڈر تھا کہ ہمارے دونوں لیڈر ایک ساتھ عزام پاشا سے اگر ملے تو ان پر کوئی خوش گوار اثر نہ ڈال سکیں گے۔ ساتھ ہی مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ وہ دونوں بھی ایک ساتھ ملنا پسند نہ کریں گے۔

"جواہرلال نہرو نحاس پاشا سے ملنے جارہے ہیں"۔ میں نے عادل ثابت کو بتایا "اور ساڑھے نو بجے سے پہلے واپسی ممکن نہیں ہے۔"

"چلو مسٹر جناح ہی سے باتیں کریں"۔ جواہرلال جی کا پروگرام سن کر عادل نے تجویز پیش کی۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے" ان کی تائید کرتے ہوئے میں نے کہا "جاؤ پھر تم ہی ان سے بات کرلو۔"

قاہرہ میں نہرو جناح کی ایک شام

"یہ نہیں ہو سکتا" عادل نے اصرار کرتے ہوئے کہا "یہ تمھارا ڈپارٹمنٹ ہے، بات تو تم ہی کو کرنی ہے۔"

"اچھا چلو" ان کی بات مانتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی یاد آیا کہ جناح صاحب نے دوبارہ ملنے کی بھی ہدایت کی تھی۔

"آجاؤ" دستک کے جواب میں جناح صاحب نے جواب دیا۔

ہم اندر داخل ہوئے تو اسی آرام کرسی پر وہ بیٹھے تھے، جس پر پہلے میں نے انھیں دیکھا تھا۔ کرسی کی بغل میں ایک چھوٹی سی میز پر وسکی کا گلاس رکھا تھا، جو آدھا خالی ہو چکا تھا۔

"آپ عادل ثابت ہیں، عرب لیگ کے چیف آف پروٹوکول" عادل کا میں نے تعارف کرایا۔

"تشریف رکھیے" کھڑے ہو کر عادل ثابت سے ہاتھ ملاتے ہوئے جناح صاحب نے فرمایا۔

کچھ دیر کمرے میں مکمل سکوت رہا۔ ہم میں سے ہر شخص غالباً گفتگو کرنے کے عنوان کا متلاشی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ عزام پاشا کی بات عادل شروع کریں، لیکن انھوں نے چپ سادھ لی۔

"عزام پاشا آپ سے اور جواہر لال نہرو سے تھوڑی دیر کے لیے ملنا چاہتے ہیں" بالآخر میں ہی نے شروع کیا۔

"میں تو خود عزام پاشا سے ملنے کے لیے بے قرار ہوں" جناح صاحب یہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے "میں تو یہ مژدہ سننے کا منتظر ہی تھا۔"

"تو وہ کس وقت تشریف لائیں؟" اس بار عادل نے سوال کیا۔

"نو بجے" بلا توقف اور بغیر گھڑی دیکھے ہوئے جناح صاحب نے جواب دیا۔

"اچھا اب ہمیں اجازت دیجیے" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا میرے ساتھ ہی عادل بھی کھڑے ہو گئے۔

"جلدی کیا ہے" جناح صاحب نے بڑی شفقت سے فرمایا" اور تم سے تو میں نے دوبارہ ملنے کے لیے بھی کہا تھا"

"وقت کم ہے اور عزام پاشا کو اطلاع بھی دینی ہے" عادل نے جواب دیا۔

"یہ ہے ٹیلیفون" ایک میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جناح صاحب نے فرمایا۔

"اور نہرو کا کیا ہوگا؟" عادل نے مجھ سے عربی میں آہستہ سے سوال کیا۔

"ساڑھے نو بجے" میں نے بھی ٹوٹی پھوٹی عربی ہی میں جواب دیا۔

"مضبوط"؟ عادل نے عربی میں پوچھا کہ بات پکی ہے نا؟

"ایوہ مضبوط" میں نے جواب دیا — ہاں بات پکی ہے۔

جناح صاحب سے اجازت لے کر عادل نے عزام پاشا کو اطلاع دی کہ دونوں سے ایک ساتھ ملاقات ممکن نہیں ہے۔ جناح صاحب سے نو بجے اور جواہر لال نہرو سے ساڑھے نو بجے ملاقات ہوگی۔ عادل ٹیلیفون کی طرف بڑھے تو جناح صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ بات چیت کا سلسلہ انھوں نے وہیں سے شروع کیا جہاں سے سہ پہر کو ختم ہوا تھا۔

"مجھے افسوس ہے" نرم لہجے میں انھوں نے فرمایا "تمھاری دعوت میں قبول نہ کر سکا، حقیقتاً میں تھکا ہوا ہوں، تم نے دیکھا ہوگا کہ اس کمرے سے باہر میں نے قدم نہیں رکھے، لیکن تھکا بھی نہ ہوتا تو تمھاری دعوت قبول نہ کرتا۔ حالات اسی کے مقتضی ہیں۔ آج ہندستانی مسلمان میدانِ جنگ میں ہے۔ تم نے یہ بھی کہا تھا" جناح صاحب نے مجھے یاد دلایا "کہ ہندستانی مسلمانوں کی یہاں کوئی انجمن نہیں ہے"۔

"جی ہاں، ہندستانی مسلمانوں کی کوئی انجمن نہیں ہے"۔

"تو یہ کمی تم پوری کیوں نہیں کرتے؟" پھر کچھ رک کر انھوں نے فرمایا "یہ خدمت انجام دینا تمھارا قومی فرض ہے"۔

"میں اس کا اہل نہیں ہوں، اور..."

اس کے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ عادل ثابت ٹیلیفون سے فارغ ہو کر میری بغل ہی میں آ بیٹھے تھے۔ جناح صاحب سے بحث کرنے کی میں یوں بھی ہمت نہ کرتا پھر مجھے اس کا بھی دھڑکا تھا کہ گفتگو کے دوران کہیں انھیں غصہ نہ آجائے یا بات چیت میں کہیں تلخی نہ پیدا ہو، جو کسی غیر ہندستانی کی موجودگی میں مناسب بات نہ ہوتی۔ میں نے سنا تھا کہ سیاسی معاملات میں وہ بحث کے عادی نہیں ہیں۔ ان کی تنک مزاجی اور ان کے آمرانہ انداز کے بھی بہت سے قصے میں سن چکا تھا، اس لیے میں اور بھی خائف تھا لیکن اس وقت کی گفتگو کے اہم اجزا پیش کرنے سے پہلے میں اس امر کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جناح صاحب کا جو تجربہ مجھے ہوا، وہ ان باتوں

سے بالکل مختلف تھا جو میں نے ان کے بارے میں سنی تھیں، یا جو ان سے منسوب کی جاتی ہیں۔ میں ان سے قطعاً بحث کرنا نہیں چاہتا تھا، لیکن انھوں نے کرید کرید کر مجھے اس کی ہمت دلائی، اور پھر نہایت شفقت سے میری باتوں کو سنا، اور بڑی نرمی سے میرے سوالوں کے جواب دیے۔

"ہاں! کیا کہتے کہتے تم چپ ہو گئے؟" جناح صاحب نے سوال کیا۔

"میں عرض کر رہا تھا" میں نے ہمت کر کے کہا "جو خدمت آپ میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں، میں اس کے لیے موزوں نہیں ہوں۔"

"کیوں؟"

"میرا خیال ہے" میں نے رک رک کر جواب دیا "مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلافات کی نوعیت تقسیم وراثت کے اس جھگڑے کی سی ہے، جو دو بھائیوں میں کبھی کبھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس سلسلے میں اکثر ایک بھائی دوسرے بھائی کے خون کا پیاسا بھی ہو جاتا ہے۔ ہمارا بھی آج شاید یہی حال ہے۔ اس خانگی جھگڑے کو ہندستان ہی تک ہم محدود رکھیں تو اچھا ہے۔ غیر ملکوں میں اپنے متعفن کپڑوں کی نمایش میرے خیال میں کوئی مستحسن بات نہیں ہے۔"

"مسلم لیگ کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟"

یہ سوال سننے اور اس کا جواب دینے کے لیے میں بالکل تیار نہیں تھا۔

اسے سنتے ہی میں کچھ بوکھلا سا گیا، اور خاموش رہا، شاید سوچ رہا تھا کہ اس کا جواب کیا دیا جائے۔

"بولو" جناح نے ہمت دلائی "بولتے کیوں نہیں!"

"اگر مجھ سے کہا جائے کہ جناح پر ایمان لے آؤ تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا" یہ کہتے ہوئے میں چل پڑا "لیکن شرط یہ ہے کہ ایک بات پر آپ مجھے مطمئن کردیں"

"وہ بات کیا ہے"؟ جناح صاحب نے ایک عجیب مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ہمارے ملک میں اوسط عمر ۲۸ سال ہے۔ خدا نے آپ کو اتنی عمر دی ہے۔ میری دعا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے آپ بہت دنوں تک زندہ رہیں۔ لیکن آپ کی آنکھ، خدانخواستہ کل اگر بند ہوجائے تو مسلم لیگ میں کوئی آپ کی جگہ لینے والا ہے؟"

"ہندستان کا ہر مسلمان میری جگہ لے سکتا ہے!" فاتحانہ انداز سے جناح صاحب نے جواب دیا۔

"مسٹر جناح آپ سے بحث کرنا میرا منصب نہیں ہے" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "لیکن میں بڑے ادب سے عرض کردوں گا کہ ہندستان سے باہر رہنے کے باوجود ہندستان کے حالات سے میں بے خبر نہیں، بلکہ بڑی حد تک باخبر ہوں"۔

"مسلم لیگ میں کسی پر بھی تمھیں بھروسہ نہیں؟"

"آپ بہت بڑے سیاست داں اور بیرسٹر ہیں" میں نے

کہا "آپ نے میرے سوال کا رخ بدل کر جواب کی ذمے داری پھر مجھ ہی پر ڈال دی ہے۔ آپ اگر اصرار کریں گے تو میں پھر اپنی پہلی ہی بات اور زیادہ واضح الفاظ میں دہراؤں گا کہ مسلم لیگ میں محمد علی جناح کے سوا اور کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا" میرے اس جواب پر جناح صاحب مسکرائے اور چند لمحوں تک بالکل خاموشی رہی۔

"میرے بچے! تم بات صاف کیوں نہیں کرتے؟" انھوں نے دوسرے انداز سے پھر اپنا پہلا سوال دہرایا "مسلم لیگ میں تم کن لوگوں کو بُرا سمجھتے ہو، اور کیوں بُرا سمجھتے ہو؟"

جناح صاحب کا انداز تخاطب اور ان کے لہجے کی نرمی میرے پھر آڑے آئی۔ میں نے سوال کیا۔

"کہاں سے شروع کروں؟"

"جہاں سے تمھارا جی چاہے۔"

"مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی سے شروع کروں؟"

"ہاں تمھیں اجازت ہے!" پھر بڑی سنجیدگی سے اتنا اور انھوں نے اضافہ کیا "میں تمھارے ذہن کو سمجھنا اور تمھیں مطمئن کرنا چاہتا ہوں۔"

"سب سے پہلے بیگم شاہ نواز کو لیجیے، جنھیں آج کل آپ نے امریکا بھیجا ہے۔ وجے لکشمی پنڈت کی تقریروں کے جواب میں تقریریں کرنے کے لیے۔ اپنے باپ سے جو سیاسی ذہن انھیں ورثے میں ملا ہے، اس سے آپ مجھ سے بہتر واقف ہیں۔ اس سے

قطع نظر، لڑائی جب شروع ہوئی تو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی وہ ممبر تھیں۔ مسلم لیگ کی قرارداد کی خلاف ورزی کر کے انھوں نے وائسرائے کی اکزیکیٹو کونسل کی ممبری قبول کر لی۔ آپ نے مسلم لیگ سے انھیں نکال دیا۔ لڑائی ختم ہونے لگی تو وہ ایگزیکیٹو کونسل سے الگ ہوگئیں، اور آپ نے اسی عزت و احترام کے ساتھ انھیں پھر اپنی ورکنگ کمیٹی میں لے لیا۔ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کا ممبر منتخب کرایا، اور امریکا کے دورے پر بھیج دیا۔ کیا آپ فرمائیں گے کہ آپ کی جگہ وہ لے سکتی ہیں؟"

جناح صاحب نے یہ باتیں خاموشی سے سنیں۔ پھر میں نے فیروز خاں نون، قاضی عیسیٰ، اصفہانی، خلیق الزماں، فضل الحق اور دوسروں کے سیاسی چٹھے ان کے سامنے اسی طرح کھول کر رکھے اور وہ سنتے رہے، لیکن اسی سلسلے میں جب میں نے لیاقت علی خاں کا ذکر کیا تو جناح صاحب نے مجھے ٹوکا۔

"میرے بچے! اب وہ بالکل بدل چکے ہیں!" انھوں نے پورے اعتماد کے ساتھ یقین دلایا "تم ان سے باتیں کر کے دیکھو۔"

"میں تم سے ایک بات کہتا ہوں" انھوں نے کچھ دیر بعد پھر شروع کیا "خود غرض کس کے ساتھ نہیں ہوتے۔ اتاترک، ہٹلر اور مسولینی کے ساتھ نہیں تھے؟"

"آپ نے اپنا مقابلہ ہٹلر اور مسولینی سے کیا ہے" میں نے ڈرتے ڈرتے اور دھیمے لہجے میں کہا "ہٹلر، مسولینی، اور ان کی قوموں کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ آپ نے شروع

میں فرمایا تھا کہ ہندوستانی مسلمان آج میدانِ جنگ میں ہے، خدا کرے ان کا وہ حشر نہ ہو جو جرمن اور اطالویوں کا ہوا ہے۔"
یہ سن کر جناح صاحب کے چہرے کا رنگ کچھ بدلا۔ عادل ثابت جو میرے قریب ہی بیٹھے یہ مکالمہ سن رہے تھے، انھوں نے شاید محسوس کیا کہ ہماری بات چیت خطرناک موڑ پر آگئی ہے۔ مجھے مخاطب کر کے انھوں نے کہا:

"نو بجنے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے، صرف بیس ہی منٹ باقی ہیں۔ اب جناح صاحب کو ہمیں تنہا چھوڑ دینا چاہیے۔"

"باتوں میں وقت کا مجھے بھی دھیان نہیں رہا" کہتے ہوئے جناح صاحب بھی ہمیں رخصت کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اور عادل سے معذرت کرتے ہوئے کہا: "مجھے شرمندگی ہے کہ آپ سے بالکل باتیں نہ کر سکا، بلکہ ہم اپنی باتوں سے آپ کو بور کرتے رہے۔ لیکن کیا کیا جائے ——— آج ہندوستانی مسلمان غیر معمولی دور سے گزر رہا ہے۔ خدا ہمارے حال پر رحم کرے۔"

"آمین" عادل نے عربی میں کہا۔

"مجھے آپ سے معافی مانگنی ہے"۔ میں نے معذرت کے انداز میں جناح صاحب سے کہا "آپ کی فیاضی اور شفقت سے شاید میں نے ضرورت سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔"

"تم سے باتیں کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی، لیکن تم انتہا پسند ہو۔" جناح صاحب نے کہا۔

"میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔"

"میرے بچے!" میرے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے جناح صاحب نے فرمایا "تم نے جو کچھ کہا ہے۔ میں اس سے بہت زیادہ جانتا ہوں۔ ہر شخص کی خامیوں سے میں خوب واقف ہوں" پھر میرے کاندھوں کو دباتے ہوئے انھوں نے مزید فرمایا "میری طرف دیکھو، ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں! مجھے تمھارے جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے، جو ایمان دار ہوں، نڈر ہوں، بے باک ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔ اچھا خدا حافظ" آخری الفاظ میں نے اردو ہی میں کہے تھے۔

"مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!" میرے خدا حافظ کے جواب میں جناح صاحب نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے انگریزی لہجے میں یہ مصرعہ دہرایا۔

"مسلم لیگ میں اگر میں آؤں تو میاں افتخار الدین کے ساتھ ہوں گا۔" خدا جانے کیوں اس وقت میاں صاحب مجھے یاد آ گئے!

"اب وہ افتخار نہیں ہیں جو کانگرس میں ہوا کرتے تھے" جناح صاحب نے جواب دیا "اب وہ مسلمان ہیں۔"

"مسلم لیگی یا مسلمان؟" میں نے ہنس کر سوال کیا۔

"دونوں ہیں" انھوں نے سنجیدگی سے جواب دیا "ہر مسلمان کی طرح آج ان کا بھی آخری اور قطعی مطالبہ پاکستان ہی ہے۔"

اب ہم لوگ دروازے کے قریب آچکے تھے۔
"کیا یہ مطالبہ آپ کے خیال میں واقعی ممکن الحصول ہے؟"
ساتھ ہی جلدی سے میں نے اتنا اور اضافہ کر دیا "میں نے
یہ سوال سمجھنے کے لیے ایمان داری سے کیا ہے۔"
"میں نجومی نہیں ہوں" جناح صاحب نے فرمایا "لیکن میں
یہ جانتا ہوں کہ ہم اپنی کشتیاں جلا چکے ہیں، اور اپنے
آپ کو حالات کے دھاروں کے حوالے کر دیا ہے۔ اب وہ
جہاں بھی ہمیں لے جائیں۔"
اس آخری جملے پر ہماری چالیس منٹ کی خوش گوار ملاقات کا
سلسلہ ختم ہو گیا۔

عزام پاشا ٹھیک آٹھ بج کر پچپن منٹ پر تشریف لائے۔
جناح صاحب اس وقت کھانے کے ہال میں تھے، جہاں ان کے
ساتھ لیاقت علی خاں اور ان دونوں کے سکریٹری بھی تھے، میں
نے عزام پاشا کی آمد کی اطلاع دی۔
"یہیں بلا لو" انھوں نے جواب دیا۔
عزام پاشا کو ساتھ لے کر میں کھانے کے ہال میں گیا، اور ان
دونوں کا تعارف کرا کے الٹے پاؤں واپس لوٹ آیا۔ اب مجھے
جواہر لال جی کی فکر ہوئی جنھیں عزام پاشا سے ملاقات طے ہونے
کا علم بھی نہیں تھا۔ عادل کو وہیں چھوڑ کر میں گینیشی لال کے
فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ وہاں پہنچا تو جواہر لال جی تقریر کر رہے تھے۔

چار پانچ منٹ تک میں سنتا رہا۔ تقریر ختم ہونے کے بظاہر کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اُن کا کوئی سکریٹری بھی وہاں نظر نہ آیا۔ ایک کاغذ پر میں نے لکھا کہ عزام پاشا ٹھیک ساڑھے نو بجے آپ سے ملنے آرہے ہیں اور ان کی طرف بڑھا دیا۔

"بس پانچ منٹ اور" اسے پڑھنے کے بعد انھوں نے جواب دیا۔

میں نے گھڑی دیکھی تو اس وقت نو بج کر گیارہ منٹ ہوئے تھے۔ حسب وعدہ انھوں نے پانچ منٹ میں تقریر اس طرح ختم کی جیسے وہ پہلے ہی سے اس کے لیے تیار ہوں۔ مجمع نے، جو چالیس پچاس آدمیوں سے زیادہ نہیں تھا، ان کے ساتھ "جے ہند" کا نعرہ لگایا اور وہ کمرے سے نکل کھڑے ہوئے۔

"اوپر فلیٹ سے شیپرڈس ہی نظر آتا ہے نا؟" لفٹ سے نیچے آتے ہوئے انھوں نے سوال کیا۔

"جی ہاں! اس عمارت اور شیپرڈس کے بیچ میں صرف ایک سڑک ہے۔ گاڑی سے چار پانچ منٹ کا اور پیدل صرف دو منٹ کا راستہ ہے۔"

"اچھا تو پیدل ہی چلو۔"

راستے میں عزام پاشا سے ملاقات ہونے کا قصہ میں نے سنایا۔

"ساتھ ملنے کی مصیبت سے بچا کر تم نے بڑا احسان کیا ہے" جواہر لال جی نے کہا "اب ان سے اطمینان سے کچھ

باتیں ہو سکیں گی۔"

ہم شیپرڈس پہنچے تو نو بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ عادل بڑی بے چینی سے ہوٹل کے کاری ڈار میں ٹہل رہے تھے۔ ہمیں آتا دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ جواہرلال جی کو لفٹ تک پہنچانے کے بعد میں عادل کی طرف متوجہ ہوا۔

"نو بج کر تیس منٹ ہو چکے ہیں" میں نے ان سے کہا "اب تم جا کر پاشا کو یاد دلا دو۔"

عادل کھانے کے ہال کی طرف بڑھے تو سامنے سے عزام پاشا آتے دکھائی دیے، جو نو بج کر پچیس منٹ پر جناح صاحب سے رخصت ہو چکے تھے۔ اب انھیں لے کر جواہرلال جی کے کمرے کی طرف چلا، ان کے کمرے کے دروازے کھلے تھے۔ لیکن عزام باہر ہی رک گئے۔ میں اندر گیا تو جواہرلال جی منتظر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گئے، اور اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکے۔ دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ عزام پاشا کا ہاتھ پکڑ کر جواہرلال جی انھیں اندر لے گئے۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اتر کر نیچے آیا تو عادل ایک صوفے پر نیم دراز نیم خوابی کے عالم میں تھے۔

"یار تم بھی عجیب آدمی ہو" عادل نے کہا "جناح صاحب سے تم تو بھڑ ہی گئے۔"

"میں تو بھاگنا اور بحث سے بچنا چاہتا تھا" میں نے جواب دیا "جناح صاحب نے بھاگنے کا راستہ ہی نہ دیا۔"

"مجھے تو ڈر معلوم ہو رہا تھا" عادل نے کہا "مگر شکر ہے کہ گفتگو خیر و خوبی سے ختم ہو گئی۔ اچھا سنو! میں تھک بہت گیا ہوں اور بھوک بھی لگی ہے۔"

"میری حالت بھی تم سے بہتر نہیں ہے۔"

"چلو کھانا یہیں کھالیں۔"

"ہاں یہ تجویز مناسب ہے اور یہ دونوں ایک گھنٹے سے پہلے ایک دوسرے کو نہ چھوڑیں گے۔"

کھانے کے ہال سے ہم نکلے تو ساڑھے دس ہو چکے تھے۔ باہر آکر دیکھا تو حسب توقع عزام پاشا کی گاڑی کھڑی تھی۔

"تمہیں تو ٹھہرنا ہی ہے" عادل نے کہا "مجھے نیند بہت آرہی ہے۔ اب پاشا کو تم ہی گھر تک پہنچا دینا، اور وہیں سے اپنے یہاں چلے جانا۔"

عادل کے رخصت ہونے کے بعد میں ترلوک سنگھ اور منتھائی کے کمرے میں آبیٹھا، جو جواہر لال جی کے کمرے کے بالکل سامنے ہی دس پندرہ گز کے فاصلے پر تھا۔

جواہر لال جی اور عزام پاشا دونوں باتوں میں ایسے محو ہوئے کہ وقت کا ان میں سے کسی کو دھیان ہی نہ رہا۔ میں دروازے کے سامنے اس زاویے سے بیٹھا تھا کہ جواہر لال جی کے کمرے کا دروازہ جیسے ہی کھلے تو مجھے نظر آجائے۔

"یہ لوگ تو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے" ترلوک سنگھ نے عاجز آکر بارہ بجے کہا "اور تین بجے جانا ہے۔ آج پنڈت جی

کو آرام کا موقع شاید بالکل نہ ملے گا۔"

"دروازہ کھٹ کھٹایا جائے؟" میں نے کہا۔

"آپ کیجیے تو کیجیے" ترلوک سنگھ نے جواب دیا "میں یہ ہمت نہیں کر سکتا۔"

"اچھا کچھ دیر اور انتظار کر لیں" میں نے کہا۔

"پورے ساڑھے بارہ بجے — ٹھیک تین گھنٹے کے بعد دروازہ کھلا، اور وہ دونوں باہر نکلے، میں بھی لپکا۔

"تمھیں بہت انتظار کرنا پڑا" عزام پاشا نے مجھ سے کہا۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ دونوں نے شاید تفصیل سے مسائل پر گفتگو کر لی ہے۔"

یہ باتیں کرتے ہوئے ہم لوگ لفٹ کے قریب آ چکے تھے۔ جواہر لال جی ساتھ تھے۔ ان دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ پھر جواہر لال جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"تمھارا بہت بہت شکریہ، تم نے آج بہت پریشانی اٹھائی ہے۔"

"مجھے اس کا افسوس ہے کہ آپ کو رخصت کرنے ہوائی اڈے نہ جا سکوں گا، کیوں کہ مجھے عزام پاشا کے ساتھ جانا ہے۔"

"تمھیں اس کی بالکل ضرورت نہیں — اچھا، خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

شیپرڈس سے روانہ ہونے کے بعد کچھ دیر میں اور عزام پاشا دونوں بالکل خاموش رہے۔

"آپ آج بہت تھک گئے ہوں گے!" میں نے سلسلۂ کلام

شروع کیا۔

"جسمانی طور سے تو تھکا ضرور ہوں" عزام پاشا نے جواب دیا "لیکن ذہنی اعتبار سے تر و تازہ بھی ہو گیا ہوں۔ نہرو اور جناح دونوں کو لندن سے واپسی پر چند روز قاہرہ میں قیام کرنے کی میں نے دعوت دی ہے۔ نہرو نے معذرت کی۔ انھیں جلد سے جلد ہندستان واپس جانا ہے۔ کیوں کہ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا ہے۔"

"اور جناح صاحب نے دعوت قبول کی؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں وہ اور لیاقت علی خاں واپسی میں چار روز یہاں ٹھہریں گے۔"

"ہمارے لیڈروں کے بارے میں آپ نے کیا رائے قائم کی؟"

"جناح تجربے کار سیاست داں ہیں اور نہرو جوشیلے قوم پرست ہیں۔ عالمی مسائل پر بھی جناح کے مقابلے میں وہ زیادہ گہری نظر رکھتے ہیں۔"

خط کا راز

سر آغا خاں نے، پہلی ملاقات کے ڈھائی تین مہینے بعد، پھر قاہرہ کا ایک پھیرا کیا، اور اس بار دو ڈھائی مہینے ان کا قیام رہا۔ ایک اسمٰعیلی نوجوان، ابراہیم بھائی، قاہرہ میں فر کا کاروبار کرتے تھے۔ رہنے والے تو وہ ایسٹ افریقہ کے تھے۔ لیکن ہندستانی الاصل ہونے کی نسبت سے ہماری انڈین یونین کے بھی سرگرم ممبر تھے۔ ایک دن سہ پہر کو دوکان سے اٹھ کر یونین کے دفتر آ گئے۔ اس وقت ریاض الدین فاروقی صاحب بھی وہاں موجود تھے، جو یونین کے وائس پریسیڈنٹ تھے۔

"ہز ہائی نس نے آپ کو یاد کیا ہے" ابراہیم نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مجھ سے کہا۔

"کیوں؟" فاروقی نے اور میں نے ایک ساتھ سوال کیا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں" ابراہیم نے اس لہجے میں سوال کیا، جیسے ہمارا سوال ان کے لیے غیر متوقع رہا ہو۔ انھیں شاید یقین

تھا کہ ہز ہائی نس سر آغا خاں کا بلاوا سنتے ہی، میں چلنے کے لیے تیار ہو جاؤں گا۔

"آخر بات کیا ہے؟" اپنا سوال میں نے دہرایا۔

"ممکن ہے کہ قاہرہ میں رہنے والے ہندستانیوں کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتے ہوں"۔

ابراہیم کا یہ جواب میرے لیے اور زیادہ حیران کن تھا۔ ان سے نظریں بچا کر میں نے اور فاروقی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کیں، اور دوسرے دن چلنے کا وعدہ کر لیا۔ ابراہیم کے جانے کے بعد ہم دونوں دیر تک اس گتھی کو سلجھاتے رہے کہ قاہرہ میں رہنے والے ہندستانی ہز ہائی نس کو کیوں یاد آئے ہیں۔ مجھے تو قاہرہ آئے ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے، لیکن فاروقی کی تو، کہنا چاہیے کہ، عمر یہیں گزری تھی۔ اور اس عرصے میں نہ جانے کتنی بار سر آغا خاں قاہرہ آئے ہوں گے، مگر یہاں کسی ہندستانی کو ان کی شکل دیکھنا بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ ہم لوگ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندستان کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے ان کو قاہرہ میں رہنے والے ہندستانیوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔ یہی حال قاہرہ کے برطانوی سفارت خانے کا بھی تھا۔ عبوری حکومت کے قیام سے قبل کوئی ہندستانی اگر سفارت خانے جاتا، تو معمولی افسر سے ملنے کے لیے بھی اسے گھنٹوں انتظار کی زحمت اٹھانی پڑتی اور پھر متعلقہ افسر سیدھے منہ بات بھی نہ کرتا۔ لیکن عبوری حکومت کے قیام نے صورت حال یک سر بدل دی۔ اب اگر کوئی ہندستانی برطانوی سفارت خانے جاتا، تو اسے

انتظار نہ کرنا پڑتا اور متعلقہ افسر اخلاق سے ملتا، اپنی جگہ سے اٹھ کر ہاتھ ملاتا اور اکثر رخصت ہوتے وقت کمرے کے دروازے تک چھوڑنے آتا۔ سفارت خانے کی پارٹیوں میں بھی ہندستانیوں کو، خصوصاً یونین کے عہدے داروں کو، مدعو کیا جاتا۔

اس مرتبہ سر آغاخاں کا قیام شیپرڈس میں نہیں، بلکہ مینا ہاؤس میں تھا، جو شہر سے بارہ چودہ میل دور، اہرام کے دامن میں، قاہرہ کا اعلا ترین ہوٹل تھا۔ گولف اور ٹینس کے ہرے بھرے میدانوں کے علاوہ متعدد نہانے کے تالاب — سوئمنگ پول — بھی تھے۔ یہ باتیں شیپرڈس کو بھی نصیب نہیں تھیں۔

ابراہیم ہم لوگوں کو لے کر مینا ہاؤس پہنچے تو سر آغاخاں ہم لوگوں کے منتظر تھے۔ بڑی گرم جوشی اور بے تکلفی سے ملے۔ لندن جاتے ہوئے قاہرہ میں نہرو اور جناح کے مختصر قیام کی اور لندن سے واپسی پر جناح اور لیاقت کے چار روزہ قیام کی تفصیلات کرید کرید کر پوچھتے رہے۔ پھر قاہرہ میں رہنے والے ہندستانیوں کا حال پوچھتے رہے۔

مجھ سے بات چیت انگریزی میں ہوئی۔ فاروقی صاحب انگریزی سمجھ تو لیتے تھے لیکن بول نہیں سکتے تھے، لیکن عربی خوب بول لیتے تھے۔ آج پتہ چلا کہ وہ ٹوٹی پھوٹی فارسی بھی بول سکتے تھے۔ آغاخاں فارسی تو بڑے فراٹے سے بولتے تھے، جو ان کی مادری زبان تھی۔ عربی بول چال ان کی ایسی ہی تھی جیسی فاروقی کی فارسی تھی۔ اس وقت ان دونوں نے اپنا کام عربی و فارسی سے نکالا۔ سر آغاخاں اردو بھی اچھی طرح

سمجھ لیتے تھے، لیکن صاف بول نہیں سکتے تھے۔ لیکن ان کی اردو بول چال جناح صاحب سے یقیناً بہتر تھی۔ گجراتی بھی وہ بے دھڑک بولتے تھے، جو ان کی ثانوی زبان تھی۔ انگریزی کے علاوہ یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی ان کو مہارت حاصل تھی۔

ہندستان کی سیاسی صورت حال کا سر آغا خاں نے بڑے دکھ کے ساتھ ذکر کیا، اور عبوری حکومت میں مسلم لیگ اور کانگرس کی رسہ کشی پر تاسف کرتے رہے۔ آخر میں ایشیائی کان فرنس کا انھوں نے ذکر چھیڑ دیا۔

"ایشیائی کان فرنس کے انعقاد کا مقصد کیا ہے؟" سر آغا خاں نے براہ راست سوال کیا۔

"اس سلسلے کچھ لٹریچر یونین کے نام آیا ہے، جو میں ابراہیم کی معرفت آپ کو بھیج دوں گا" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم نے ایشیائی ملکوں میں زندگی کی جو ایک نئی لہر پیدا کی ہے، اسے دوام بخشا جائے، ایشیا کے تمام ملک سر جوڑ کر ماضی کا جائزہ لیں اور حال کی روشنی میں مستقبل کی راہیں متعین کریں"۔

"خیال تو یقیناً اچھا ہے" ہز ہائی نس نے پسندیدگی ظاہر کرتے ہوئے سوال کیا "لیکن کون کون ملک شریک ہو رہے ہیں؟"

"مجھے جہاں تک معلوم ہے ایشیا کے سب ہی ملکوں کو دعوت دی گئی ہے، اور افریقہ کے اکثر آزاد و نیم آزاد ملکوں کو مبقر

کی حیثیت سے مدعو کیا گیا ہے؟

"مسلمان ملکوں نے دعوت قبول کی؟"

"ہندستانی اخباروں کے مطابق انڈونیشیا، افغانستان، ایران اور ترکی نے نیز سودیت سنٹرل ایشیا کی مسلم آبادی والی ریاستوں نے بھی شرکت کا وعدہ کیا ہے۔ باقی مسلمان ملکوں کے متعلق مجھے علم نہیں ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ آپ اس میں سرگرمی سے دل چسپی لے رہے ہیں۔

"میں نہیں بلکہ قاہرہ کی انڈین یونین دل چسپی لے رہی ہے۔"

"وہ تو ایک ہی بات ہے" سرآغا خاں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "آپ شاید ہاتھ گھما کر ناک پکڑنا پسند کرتے ہیں۔"

اس گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ابراہیم کی وساطت سے ایشیائی کانفرنس کے سلسلے میں ہماری سرگرمیوں کا سرآغا خاں کو پورا علم ہو چکا تھا۔ ان کی باتوں سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کانفرنس سے انھیں بھی کسی نہ کسی نوع سے دل چسپی ضرور ہے۔

"آپ کو معلوم ہے" معنی خیز انداز میں انھوں نے سوال کیا "مصر کو کس حیثیت سے مدعو کیا گیا ہے۔"

"میرا گمان ہے کہ ممبری کی حیثیت سے دعوت دی گئی ہے، کیوں کہ مصر افریقی سے زیادہ ایشیائی ملک ہے۔"

"آپ کے اس خیال سے میں بھی متفق ہوں کہ مصر افریقی سے زیادہ ایشیائی ملک ہے، لیکن مبصر کی حیثیت سے بھی مصر کو

اس کانفرنس میں شریک ہونے میں تامل ہے۔"

"مجھے اس کا علم نہیں ہے۔"

"مولانا کرم علی اور مولانا عبدالعلیم تو آپ سے مل چکے ہیں، مجھ سے بھی ملنے آئے تھے اور کل پھر آئیں گے" پھر کچھ رک کر انھوں نے کہا "اور ان کے یہاں آنے کے مقصد سے بھی آپ بے خبر نہ ہوں گے۔"

مولانا کرم علی[1] ملیح آباد کے اور مولانا عبدالعلیم[2] صدیقی میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ مولانا کرم علی مجھ سے ذاتی طور پر بھی واقف تھے۔ میرے کئی بزرگوں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ اسی بنا پر مجھ سے بزرگانہ انداز سے پیش آتے۔ جناح صاحب اور لیاقت علی خاں کے قاہرہ سے لوٹنے کے چار پانچ ہفتے کے بعد یہ دونوں بزرگ مسلم لیگ کے غیر سرکاری سفیر کی حیثیت سے عرب ملکوں کے دورے پر آئے۔ قاہرہ پہنچنے کے دوسرے ہی دن مجھ سے ملنے کے لیے عرب لیگ کے

---

[1] مولانا کرم علی آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے ممبر تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان گئے، اور پھر وہاں سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے۔ لیکن پھر مراجعت کر کے ہندستان آ گئے۔ تقریباً دو سال ہوئے یہیں وفات پائی۔

[2] مولانا عبدالعلیم بھی تقسیم کے بعد پاکستان نہیں گئے۔ ہندستان ہی میں رہے اور یہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔

دفتر تشریف لائے، اور اپنے سفر کا مقصد اسلامی ملکوں کی سیاحت بیان کیا۔ لیکن دو تین دن کے اندر ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ ان کا اصلی مشن ایشیائی کانفرنس اور کانگرس کے خلاف پروپگنڈا کرنا اور عرب ملکوں کو اس کانفرنس میں حصہ لینے سے باز رکھنے کی کوشش ہے۔ مصر کے وزیر اعظم نقراشی پاشا، عرب لیگ کے سکریٹری جنرل عزام پاشا اور مفتی فلسطین کے علاوہ قاہرہ کے غیر سرکاری سیاسی حلقوں میں انھوں نے گشت لگایا، لیکن اخوان المسلمون کے علاوہ کسی نے ان کی ہمت افزائی نہیں کی۔

قاہرہ کی ہندستانی آبادی نے ان دونوں کو یکسر قابل اعتنا نہ سمجھا۔ مولانا کرم علی کے اصرار پر ہندستانیوں کا ایک جلسہ بھی ہم نے کیا۔ اتفاقاً ان ہی دنوں جالندھر میں ایک فرقہ وارانہ فساد بھی ہوا تھا۔ مولانا عبدالعلیم نے اپنی تقریر میں جالندھر کے مسلمانوں کے جانی و مالی نقصان کا بڑا دردناک نقشہ پیش کیا۔ ایک جالندھری مسلمان، معراج دین، بھی جلسے میں موجود تھے۔ انھوں نے مولانا کی بات کاٹ کر کہا:

"سنیے مولانا! جالندھر میں جو مسلمان مارے گئے ہیں، ان میں کچھ میرے عزیز اور کچھ میرے دوست بھی ہیں۔ اس کی جو تکلیف مجھے ہو سکتی ہے، آپ کو نہیں ہو سکتی۔ لیکن وہاں جو ہندو مارے گئے ہیں، ان کے مارے جانے کا بھی مجھے دکھ ہے۔ وہ سب بھی میرے ہم وطن ہی تھے۔"

معراج دین کی بات سن کر مولانا عبدالعلیم سناٹے میں آ گئے، اور اپنی

تقریر ختم کردی۔ اس کے بعد مولانا کرم علی نے بھی تقریر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ پندرہ بیس دن قاہرہ میں قیام کرنے کے بعد یہ دونوں حضرات رخصت ہوئے۔ واپسی سے ایک روز قبل شام کو یونین کے دفتر رخصتی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ میں نے رات کے کھانے پر انھیں مدعو کیا۔ مولانا کرم علی نے کھانے کے دوران شکایتاً کہا کہ ان کی کامیابی کی راہ میں سب سے بڑا روڑا میری ہی ذات ثابت ہوئی ہے۔ میں نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ان کے اس گمان میں حقیقت کا کوئی شائبہ نہیں ہے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ان کے یا ان کے مشن کے بارے میں کسی سے بھی میری کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ میری بات باور نہ کرسکے۔ بالآخر میں نے اشارتاً کہا کہ ان کے خلاف پروپگنڈے کا سب سے بڑا حربہ خود ان کی طویل وعریض داڑھیاں ہیں، جو عرب ملکوں میں یہودیوں کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہیں۔

سر آغا خاں سے ملاقات کے چھ سات دن بعد ہمارے اسمٰعیلی دوست، ابراہیم بھائی، نے حصول برکت کے لیے، اپنے روحانی پیشوا کو اپنی دوکان میں مدعو کیا۔ چند ہندستانی دوستوں کو بھی دعوت دی۔ آغا خاں نے ہر شخص سے بڑی خوش دلی سے باتیں کیں، بلکہ ان سب سے مل کر وہ اس درجہ خوش ہوئے کہ قاہرہ میں رہنے والے اور ہندستانیوں سے ملنے کی خواہش انھوں نے ظاہر کی۔ چناں چہ انڈین یونین کی طرف سے انھیں ایک ریسپشن[1] بھی ہم نے دیا،

---

[1] استقبالیہ

جس میں قاہرہ کے بیشتر ہندستانی شریک ہوئے۔

"مسٹر آصف علی امریکا جاتے ہوئے قاہرہ میں بھی قیام کریں گے ؟" اسی ریسپشن میں آغا خاں نے مجھ سے سوال کیا۔

"جی ہاں" میں نے جواب دیا "چار دن یہاں قیام کریں گے۔"

"اس کا ذکر آپ نے مجھ سے نہیں کیا۔" انھوں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"آصف علی صاحب کی آمد کی خبر ملنے کے بعد آپ سے ملنا ہی نہیں ہوا" میں نے جواب دیا "ورنہ ضرور کہتا، اور آج میرے کہنے سے پہلے ہی آپ ہی نے ذکر چھیڑ دیا۔ پانچ چھ دن ہوئے آل انڈیا ریڈیو سے یہ خبر معلوم ہوئی تھی۔ اسی دن انڈین یونین کی طرف سے ایک کیبل ان کو بھیجا گیا تھا، اس کے جواب میں پرسوں کیبل اور آج ہی ان کا خط آیا ہے۔"

کیبل اور خط اپنے بیگ سے نکال کر میں نے سر آغا خاں کے سامنے رکھ دیا۔ دونوں کو انھوں نے غور سے پڑھا۔ خط اردو میں تھا، جو شاید ٹھیک سے وہ سمجھ نہ سکے ہوں گے۔ لیکن دونوں کو وہ دیر تک اس طرح دیکھتے رہے، جیسے کوئی معمہ حل کر رہے ہوں، یا ان کی روشنی میں کوئی اسکیم مرتب کر رہے ہوں

"تو پھر اس سلسلے میں آپ نے کیا کیا؟" انھوں نے سوال کیا۔

"عزام پاشا، نحاس پاشا اور مفتی فلسطین سے ان کی ملاقاتیں طے کر لی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اور نقراشی پاشا؟"

"ان کا معاملہ ابھی طے نہیں ہوا ہے" اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے میں نے کہا "عزام پاشا سے کہوں تو شاید یہ کام وہ کردیں، لیکن ان سے درخواست کرکے ان پر یہ بات میں ثابت کرنا نہیں چاہتا کہ عرب لیگ کا ملازم ہوتے ہوئے میں ہندستان کے سرکاری وغیر سرکاری کاموں میں اتنی دل چسپی لیتا ہوں"۔

"پرسوں شام کو ساڑھے پانچ بجے محمد علی پاشا کلب میں آپ مجھ سے ملیے" ہز ہائی نس سر آغا خاں نے اپنی ڈائری دیکھنے کے بعد کہا "میں جو کرسکتا ہوں کردوں گا"۔

"آپ تو بہت کچھ کر سکتے ہیں" میں نے کہا "آپ کی بات تو یہاں کھرا سکہ ہے"۔

"یہ بات پہلے کبھی تھی" کچھ اداس لہجے میں انھوں نے جواب دیا "اب تو کھوٹا سکہ ہے۔ بہرحال پرسوں آپ ملیے۔ کھوٹا سکہ بھی کبھی کبھی چل جاتا ہے"۔

یہ بات کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مصر کے سرکاری حلقوں میں سر آغا خاں کی بڑی مان دان تھی۔ شاہ فاروق پر بھی ان کا اثر تھا۔ مصر میں ان کی خاصی جائیداد بھی تھی، اور وہاں کی صنعتوں میں بھی ان کا سرمایہ لگا تھا۔ ایک زمانے میں مصری امیر و وزیر ان کے گرد اس طرح چکر لگاتے تھے، جیسے شمع کے گرد پروانے ہوں۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد ان کی ساکھ کچھ کم ضرور ہو گئی تھی۔

محمد علی پاشا کلب قاہرہ کے 'اشرافیہ' کا کلب تھا۔ وزیر اور سفیر سب ہی وہاں جاتے تھے، اس لیے پہرے کا بھی خاصا انتظام

ہوتا تھا۔ مقررہ وقت پر وہاں پہنچا، تو مسلح سنتری نے میری ٹیکسی پھاٹک کے باہر ہی روک لی۔

"کس سے ملنا ہے؟" کلب کے ایک باوردی ملازم نے عربی میں سوال کیا۔

"ہز ہائی نس سر آغا خاں سے" میں نے جواب دیا۔

"آپ ہی کو ہز ہائی نس نے وقت دیا ہے؟" یہ سوال اس نے انگریزی میں کیا۔

"ہاں۔"

"کارڈ؟"

چند منٹ کے بعد وہ لوٹ کر آیا، اور اپنے ساتھ لے جا کر ایک بڑے سے ڈرائنگ روم میں مجھے بٹھا دیا، جہاں میرے سامنے ایک طرف محمد علی پاشا کی، اور دوسری طرف شاہ فاروق کی قد آدم تصویریں آویزاں تھیں۔ میں انھیں دیکھ ہی رہا تھا کہ ڈرائنگ روم کے اندر ہی کا ایک دروازہ کھُلا اور ایک خوش پوش نوجوان، مصری وضع کی ترابوش پہنے نکلا۔

"آپ مسٹر صدتی ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"صدتی نہیں، صدیقی:" میں نے جواب دیا۔

"اس وقت صدتی پاشا بھی ہز ہائی نس کے پاس بیٹھے ہیں اس وجہ سے میری زبان سے صدتی نکل گیا" معذرت کرتے ہوئے اس نے کہا "تھوڑی دیر آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔ ہز ہائی نس کچھ ضروری باتیں کر رہے ہیں۔"

"میں انتظار کروں گا۔"

"آپ کیا پئیں گے؟"

"کافی مگر کریم کے ساتھ۔"

"صرف کافی؟" نوجوان نے سوال کیا۔

"جی ہاں، صرف کافی۔"

وزیر اعظم نقراشی پاشا کے یہ سکریٹری تھے۔ اس گفتگو کے بعد مجھ سے اجازت لے کر پھر اسی کمرے میں چلے گئے۔ قریب ہی رکھا ہوا مصری ہفتہ وار "روز الیوسف" میں نے اٹھا لیا۔ اس کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ سامنے کا دروازہ کھلا۔ اس بار ہز ہائی نس سر آغا خاں کے ساتھ نقراشی پاشا اور عزام پاشا بھی نکلے۔ عزام پاشا نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میرے سلام کا جواب دیا، اور نقراشی پاشا کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

"معاف کیجیے کچھ دیر آپ کو انتظار کرنا پڑا" ہز ہائی نے ہاتھ ملاتے ہوئے معذرت کی "مگر میں کر رہا تھا آپ ہی کا کام۔"

"میرا کام آپ کا بھی کام ہے۔"

"اسی سے تو کوشش کی" انھوں نے ہنس کر جواب دیا "نقراشی پاشا سے آصف علی کی یہیں ملاقات ہوگی۔ میں بھی رہوں گا۔"

"یہ تو بہت اچھا ہے" میں نے کہا "اس ملاقات سے پہلے بھی آصف علی آپ سے ضرور ملنا چاہیں گے۔"

"یہ ہو سکے تو بہت اچھا ہے۔"

"ضرور ہوگا۔"

اس گفتگو کے تیسرے ہی دن آصف علی قاہرہ پہنچے۔ قاہرہ کی ہندستانی آبادی نے ان کے شایانِ شان ان کا استقبال کیا۔ شیپرڈس کے ان ہی کمروں میں ان کے قیام کا انتظام تھا، جن میں جواہرلال نہرو ٹھہرے تھے۔ دو سکریٹری بھی ان کے ساتھ تھے۔ ایک تو ان کے پرانے منشی ہی تھے، اور دوسرے ایک نوجوان مدراسی تھے۔ ہوائی اڈے سے اپنی قیام گاہ کی طرف وہ روانہ ہوئے، تو موٹروں اور ٹیکسیوں کا ایک قافلہ سا جلوس کی شکل میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ہندستان کے سرکاری لباس —— سیاہ شیروانی، شیروانی ہی کے کپڑے کی ٹوپی، اور سفید چوڑی دار پائجامے میں آصف علی یونانی مجسمہ معلوم ہو رہے تھے۔ شیپرڈس کے چبوترے پر تو یہ جلوس ایک تماشا سا بن گیا، جسے دیکھنے کے لیے سارا مجمع اٹھ کھڑا ہوا۔

ہوٹل کے اندرونی حصے میں لفٹ کی طرف ہم بڑھ رہے تھے کہ سامنے مسٹر رحیم بیٹھے نظر آئے، جو مصر میں ہمارے ٹریڈ کمشنر تھے۔ ان کا دفتر اسکندریہ میں تھا۔ آج قاہرہ میں ہونے کے باوجود آصف علی کو لینے ہوائی اڈے جانا انھوں نے غیر ضروری سمجھا تھا۔ لیکن آصف علی کو دیکھتے ہی وہ ان کی طرف بڑھے۔ قریب آئے تو تعارف کراتے ہوئے میں نے کہا:

"آپ ہمارے ٹریڈ کمشنر ہیں، مسٹر جے، عبدالرحیم۔"

"تم خاموش رہو" بھڑک کر مسٹر رحیم نے انگریزی میں کہا "میں تمھاری وساطت سے اپنا تعارف کرانا پسند نہیں کرتا۔"

آصف علی نے رحیم کو گھور کر دیکھا، لیکن میری طرح وہ بھی خاموش رہے۔ ہاتھ تو انھوں نے رحیم سے ضرور ملایا، مگر ان کی مزاج پرسی کا جواب دینا بھی انھوں نے غیر ضروری سمجھا۔ ہم سب کے ساتھ ہی رحیم بھی اوپر آئے لیکن وہاں بھی آصف علی ان سے مخاطب نہ ہوئے۔ رحیم کی یہ نازیبا روش کمرے کے ماحول پر دیر تک اثر انداز رہی۔

"چائے نہیں پلوائیں گے آپ؟" آصف علی نے مجھ سے سوال کیا۔

"معاف کیجیے، میں بالکل ہی بھول گیا کہ چائے کی بھی ضرورت ہو سکتی ہے۔"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے" کشن لال نے مجھ سے کہا "چائے ابھی آ رہی ہے۔ میں آرڈر دے کر اوپر آیا ہوں۔"

اس کے بعد میں نے ان ہندستانیوں کا تعارف کرایا، جو اس وقت کمرے میں موجود تھے۔ اس کے ساتھ ہی آصف علی نے باغ و بہار باتیں شروع کیں، اور کوئی ایک گھنٹے تک وہ مجمع پر چھائے رہے۔ اسی درمیان میں مسٹر رحیم نے کھڑے ہو کر رخصت کی اجازت چاہی۔

"ان لوگوں کے رخصت ہونے کے بعد مجھ سے ملیے" آصف علی نے بے رخی کے ساتھ رحیم سے کہا "کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"آج کسی سے ملنا ہے؟" اب وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"نحاس پاشا سے سات بجے ملاقات طے ہوئی ہے" میں نے

جواب دیا۔

"یہ تو سر عبدالرحیم جیسے انگریز پرست کے بیٹے ہیں" سب کے رخصت ہونے کے بعد آصف علی نے مجھے روک کر رحیم کی بدتمیزی کی معذرت کرتے ہوئے کہا "یہ تو مجھے لینے ایرپورٹ بھی نہیں گئے تھے۔"

"آپ تو آپ ہیں" میں نے جواب دیا "یہ تو جواہر لال نہرو کو لینے ہوائی اڈے نہیں گئے تھے، اگرچہ یہیں موجود تھے۔ لیکن جب جناح صاحب لندن سے لوٹے تو ان کے استقبال کے لیے انقرہ گئے، انھیں کے ساتھ قاہرہ آئے، اور چار دن تک ان کے آگے پیچھے پھرتے رہے۔

"آپ سے بہت خفا معلوم ہوتے ہیں۔"

"وہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا" میں نے انھیں بتایا "پہلی ہی ملاقات میں میری ان کی خاصی لپاڈگی ہوگئی۔ یہیں شیپرڈس کے چبوترے پر فاروقی صاحب نے رحیم سے میرا تعارف کرایا۔ رسمی گفتگو کے بعد رحیم نے ہندوستانی سیاست پر باتیں چھیڑ دیں اور مولانا آزاد کو گالیاں دینا شروع کیں۔ یہ بات مجھے اور فاروقی صاحب کو بھی ناگوار ہوئی۔ یہ بات بڑھتے بڑھتے ہاتھا پائی کی نوبت آگئی، تو فاروقی صاحب مجھے اٹھا کر دوسری طرف لے گئے۔ اس کے بعد میں اور رحیم کبھی ایک میز پر نہیں بیٹھے۔ ابھی کچھ ہی دن ہوئے ایسٹ افریقہ کے ایک ہندستانی تاجر اپنی کسی کاروباری ضرورت

سے قاہرہ آئے۔ ان کے کچھ معاملات مصری حکومت اور انڈین ٹریڈ کمشنر کے دفتر سے اٹکے تھے۔ رحیم سے ملنے وہ اسکندریہ گئے اور رحیم نے ان کی مدد بھی کی۔ کسی نے میرا نام بھی انھیں بتایا، اور مجھ سے ملنے وہ عرب لیگ کے دفتر آئے۔ ایک دن انھوں نے رات کے کھانے پر مجھے مدعو کیا۔ میں پہنچا تو رحیم بھی وہاں موجود تھے۔

"تم یہاں کیوں آئے" رحیم نے میرے سلام کے جواب میں کہا۔

"رحیم صاحب میں بھی مدعو ہوں" میں نے جواب دیا۔

"میں تمھارے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا، پھر میزبان سے انھوں نے کہا "یا تو یہ یہاں بیٹھیں گے یا میں' اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میزبان رحیم کے پیچھے دوڑا۔ ایک دوست نے جو قریب ہی بیٹھے تھے، آہستہ سے مشورہ دیا کہ میں ہی اُٹھ جاؤں تو بہتر ہے، کیوں کہ رحیم اس کا کام بگاڑ دیں گے، اور اس کا لاکھوں کا نقصان ہوگا۔"

"اچھا یہ بتایئے" آصف علی نے پوچھا "نحاس پاشا کے یہاں جانے کی کیا صورت ہوگی؟"

"رحیم ہی کو ساتھ لیجیے" میں نے جواب دیا "یہاں ان کی حیثیت ہمارے سرکاری نمایندے کی ہے۔"

"انھیں میں اپنے ساتھ کہیں بھی لے جانا پسند نہ کروں گا" آصف علی نے میری تجویز رد کرتے ہوئے کہا "ان کی موجودگی سے کام بنے گا نہیں، بلکہ بگڑ جائے گا۔"

"اچھا تو فاروقی صاحب کو آپ اپنا گائیڈ بنائیں۔ وہ قابل اعتنا آدمی ہیں، اور آپ کے ترجمان کا بھی کام کر سکتے ہیں۔ نحاس پاشا انگریزی واجبی ہی جانتے ہیں۔"

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ رحیم کمرے میں داخل ہوئے۔ اور میں نے اجازت لی۔

"رات کا کھانا آپ یہیں کھائیں گے نا؟" آصف علی نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "تفصیلی باتیں کھانے ہی پر ہوں گی۔"

رات کے کھانے پر باتیں کرتے ہوئے آصف علی کو ان کے قیام کی تفصیلات میں نے ایک ٹائپ شدہ کاغذ سے پڑھ کر سنائیں۔ بہت خوش ہوئے۔ پھر کاغذ میرے ہاتھ سے لے کر خود پڑھا۔ محمد علی پاشا کلب میں ہز ہائی نس سر آغا خاں سے ملاقات، اور پھر وہیں نقراشی پاشا اور سر آغا خاں کے ساتھ چائے کا پروگرام دیکھ کر تو وہ اچھل ہی پڑے۔

"قاہرہ میں اس وقت آغا خاں کا موجود ہونا، ایک خداداد بات ہے۔" انھوں نے کہا۔

"آپ نے بالکل سچ کہا ہے" میں نے جواب دیا، اور پوری داستان انھیں سنائی۔

"یہ تو ان کے لیے یقیناً بڑی معمولی بات تھی" انھوں نے کہا "آپ ان سے بڑے بڑے کام بھی لے سکتے ہیں۔ لیکن وہ بھی آپ سے اگر کوئی کام لینا چاہیں، تو اس میں بھی آپ کو بخل نہ کرنا چاہیے۔

"میں بھلا ان کے کیا کام آسکتا ہوں"۔

"اس کا فیصلہ آپ نہیں، خود آغا خاں کریں گے"۔

دوسرے دن پروگرام کے مطابق آصف علی کی ملاقات نقراشی پاشا اور آغا خاں سے محمد علی پاشا کلب میں ہوئی۔ دو گھنٹے کے بعد لوٹ کر آئے، تو بہت خوش تھے۔

"آج کی ملاقات بہت مفید اور کامیاب رہی" آتے ہی انھوں نے کہا۔

"آپ کی کامیاب ملاقات کی تفصیلات پوچھنا تو میرے لیے شاید مناسب نہ ہو" میں نے کہا "لیکن یہ بتلایئے کہ ایشیائی کانفرنس کے بارے میں کچھ بات ہوئی"۔

"ہاں آغا خاں سے بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آپ نے ان سے گفتگو کی ہے، اور وہ معاملہ طے کرا دیں گے۔ نقراشی پاشا سے برسبیل تذکرہ کانفرنس کے اغراض و مقاصد کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ان کا رویہ ہمدردانہ معلوم ہوتا ہے۔ آغا خاں سے ایک بار پھر ملنا ہے، اگر آپ ضرورت سمجھیں تو میں ان سے گفتگو کر لوں"۔

"میرا اندازہ ہے کہ آغا خاں نقراشی پاشا کو کانفرنس کا دعوت نامہ قبول کرنے پر آمادہ کر لیں گے۔ آپ آغا خاں سے اس کا وعدہ لے لیجیے۔ اس وقت سارے ایشیا میں عموماً اور عرب ملکوں میں خصوصاً ہماری ڈپلومیسی کی کامیابی کا سارا انحصار اسی کانفرنس پر ہے"۔

۱

آصف علی کے رخصت ہونے کے دوسرے ہی دن سر آغا خاں نے پھر مجھے یاد فرمایا۔ چھ بجے شام کو مینا ہاؤس پہنچا۔ آج کی ملاقات ہماری طویل ترین ملاقات تھی، جس کا سلسلہ چار ساڑھے چار گھنٹے تک جاری رہا۔ پہلے تو آصف علی کے قیام قاہرہ کی باتیں ہوتی رہیں۔ آصف علی اور نقراشی پاشا کی گفتگو میں تو وہ خود بھی شریک تھے۔

"ہندستان کی سیاسی صورت حال کا آصف علی نے بڑی قابلیت سے تجزیہ کیا تھا" سر آغا خاں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے بتلایا "لیکن ہندستان کے بارے میں مصریوں کا ذہن صاف نہیں ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہاں کے حالات اتنے پیچیدہ ہیں کہ خود ہندستانیوں کی سمجھ میں نہیں آتے، تو بھلا باہر والوں کی سمجھ میں کیا آئیں گے۔ ذہنی اعتبار سے مصریوں کی ہمدردیاں کانگرس کے ساتھ ہیں، لیکن انھیں اس کا بھی علم ہے کہ ہندستانی مسلمان کانگرس کے خلاف ہیں، اور جناح ان کے مسلمہ لیڈر ہیں، پھر مصر کو بلکہ پورے عالم اسلام کو اس کا بھی احساس ہے کہ ہندستانی مسلمانوں نے دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر اسلامی ملک کا ساتھ دیا ہے۔ اس لیے کھل کر کانگرس کی حمایت کرنا ان کے لیے آسان نہیں ہے۔ اس نے سارے عالم کو ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا کر رکھا ہے۔"

"آپ کے اس تجزیے سے میں متفق ہوں" میں نے سر آغا خاں کے

خیال کی تائید کی "یہی بات بعض ذمے دار فلسطینی مسلمانوں نے بھی مجھ سے کھل کر کہی ہے۔"

"کانگرس اور مسلم لیگ میں جب تک کوئی قطعی اور آخری سمجھوتہ نہیں ہوتا" سر آغا خاں نے کہا "یہ کش مکش بدستور جاری رہے گی۔"

"آپ کو اس کی امید ہے کہ کانگرس اور مسلم لیگ میں کوئی قطعی سمجھوتہ ہو سکے گا؟"

"اچھا یا برا، غلط یا صحیح، اسے تو ہونا ہی ہے" سر آغا خاں نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "اور یہ تو آپ سے میں پوچھنا ہی بھول گیا کہ رحیم کا کیا قصہ ہوا تھا؟"

"یور ہائی نس! آپ کو تو ایک ایک بات معلوم ہے" یہ کہتے ہوئے اس قصے کو میں نے مختصراً دہرایا۔

"اس کا ایک حصہ آپ نے نہیں بیان کیا" آغا خاں نے کہا "میں نے سنا ہے کہ آصف علی نے بعد میں رحیم کی بہت خبر لی۔"

"سنا تو یہ میں نے بھی ہے، لیکن اس کی تفصیلات کا مجھے علم نہیں ہے۔"

"آصف علی نے اس کا ذکر آپ سے نہیں کیا؟"

"نہیں، انھوں نے اس کا کوئی ذکر مجھ سے نہیں کیا، اور انھیں کرنا بھی نہیں چاہیے تھا" میں نے جواب دیتے ہوئے بتلایا کہ "یہ قصہ تو ان کے مدراسی سکریٹری کی وجہ سے عام ہوا، جو اس وقت کمرے میں موجود تھا۔ اور جس نے بعد میں

ایک گجراتی تاجر کشن لال سے میرے متعلق پوچھا کہ یہ کون ہیں، جن کی وجہ سے ہز ایکسیلنسی ٹریڈ کمشنر پر اس قدر بگڑ رہے تھے؟"

"مجھ سے بھی یہ قصہ کشن لال ہی کے حوالے سے بیان کیا گیا تھا" آغا خاں نے کہا۔

آصف علی خاں اور ہندستانی سیاست کی باتیں کرتے ہوئے آغا خاں نے ہندستانی لیڈروں کے متعلق بھی برسبیل تذکرہ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

گاندھی جی: "سیاست داں ہیں، اور انسانیت دوست بھی۔ ان کے سیاسی شعور پر بھی ان کی انسانیت دوستی غالب آجاتی ہے۔ اسی سے ان کے فکر وعمل میں کبھی کبھی عدم مطابقت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔"

جواہر لال نہرو: "جذباتی ہیں۔ دل قوم پرست اور ذہن بین الاقوامی پایا ہے۔ ان ہی دونوں کی کشمکش ان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ مجھ سے بہت خفا ہیں۔"

سردار پٹیل: "پہلے تو بہت اچھے آدمی تھے۔ اب نہ جانے کیسے ہو گئے ہیں۔ پہلے میرے یہاں بہت آیا کرتے تھے۔"

مولانا آزاد: "عالم ہیں، لغوی اور اصطلاحی دونوں معنوں میں۔ ان کی قوم پرستی کھرا سکہ ہے۔ کانگرس ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں معتدل دل و دماغ کے وہی مالک ہیں۔"

مسٹر جناح: "ضدی ہیں اور بددماغ بھی۔ ہندستان میں ایک

ہی آدمی ان کی ناک پکڑ کر گھما سکتا ہے' اور وہ ہے
نواب بھوپال (حمید اللہ خاں)"

"جناح صاحب کے متعلق ان کی مخالفین ہی کی نہیں، بلکہ ان کے دوستوں کی بھی وہی رائے ہے جو آپ نے بیان کی ہے" میں نے کہا "لیکن میرا تجربہ اس سے بالکل مختلف ہے"۔

اس کے بعد جناح صاحب سے اپنی ملاقات کا تفصیلی حال میں نے بیان کیا۔

"بڑے خوش قسمت ہیں آپ" سر آغا خاں نے فرمایا "میرا ایک تجربہ سنیے:

"۱۹۳۹ء میں جب مسٹر گاندھی پونہ کے آغا خاں پیلس سے رہا ہوئے تو وائسرائے اور جناح دونوں سے انھوں نے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا۔ میں ان کے اقدامات کا غور اور دل چسپی سے مطالعہ کرتا رہا۔ میرا گمان تھا کہ مسٹر گاندھی حکومت اور مسلم لیگ دونوں سے سمجھوتہ کرنے پر مائل ہیں۔ ہندستان میں میرے جو ذرایع تھے، انھوں نے بھی میرے خیال کی تائید کی۔ میرا ذہن اس معاملے میں دو اور دو چار کی طرف تھا کہ حکومت سے معاملت کی کامیابی کا سارا انحصار اس پر ہے کہ پہلے کانگرس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ ہو جائے۔ اسی خیال سے میں ہندستان گیا کہ ہو سکے تو کانگرس اور مسلم لیگ میں صلح صفائی کرانے کی کوشش کروں۔ پہلے میں نے مسٹر گاندھی سے باتیں کیں، جو اس وقت پونہ میں تھے۔ انھوں نے

میرے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ مسلم لیگ سے معاملہ طے کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ دور تک جانے کے لیے وہ تیار ہیں اور میں مسٹر جناح سے بات کرکے دیکھوں کہ وہ کس حد تک آمادہ ہیں۔ مسٹر جناح اس وقت دہلی میں تھے۔ ان سے ملنے ہی کے لیے میں دہلی گیا۔

"میرے پرانے کرم فرما اور مسٹر جناح کے قریبی دوست نواب بھوپال نے اسی سلسلے میں مجھے اور مسٹر جناح کو رات کے کھانے پر بلایا۔ کھانے کے بعد ہم لوگ باہر لان پر آ بیٹھے۔ میرے مقابل ایک آرام کرسی پر مسٹر جناح نیم دراز سگار پی رہے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جوں ہی حرفِ مطلب میں زبان پر لایا، وہ سیدھے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ دو منٹ تک خاموش سنتے رہے، پھر میری بات کاٹ کر انھوں نے کہا:

"دیکھیے یور ہائی نس! آج میں ہندستانی مسلمانوں کا واحد نمایندہ ہوں۔ لیکن اگر آپ کو ہندو کانگرس کی نمایندگی کا ادعا ہے تو پہلے جا کر گاندھی سے اپنے لیے سند لائیے۔"

"یہ کہہ کر مسٹر جناح پھر کرسی پر لیٹ کر سگار پینے لگے۔ یہ جواب سن کر کچھ کہنے کی مجھے بالکل ہمت نہ ہوئی۔"

"اسی سے ملتا جلتا جناح صاحب کا ایک قصہ میں آپ کو سناؤں، جو ایک ہندستانی دوست نے یورپ جاتے ہوئے، حال ہی میں سنایا تھا۔ اور یہ بھی کم و بیش اسی زمانے کا ہے، جس زمانے کا آپ نے سنایا ہے۔"

"ضرور سنائیے" سر آغا خاں نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
"یہ ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور جناح صاحب کی ملاقات کا قصہ ہے اتفاقاً یہ دونوں سری نگر میں تھے۔ جناح صاحب نے ڈاکٹر اشرف کو ایک اہم معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے بلوایا۔ مسٹر جناح سے مل کر ڈاکٹر اشرف لوٹے تو ان کے میزبان نے محسوس کیا کہ کسی شدید ذہنی الجھن میں وہ مبتلا ہیں۔ پھر رات بھر اپنے کمرے میں وہ ٹہلتے رہے۔ صبح کو ان کے میزبان نے ان کی پریشانی کا سبب پوچھا، تو معلوم ہوا کہ مسٹر جناح نے ڈاکٹر اشرف سے کہا:
"دیکھو ڈاکٹر اشرف! دنیا میں ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ ہر انسان کی ایک قیمت ہے جسے ادا کر کے اسے خریدا جا سکتا ہے۔ میں آج ہندستانی مسلمانوں کا واحد نمائندہ ہوں، اور ان کی طرف سے ہر طرح کی معاملت کر سکتا ہوں۔ تم بتاؤ تمھاری کیا قیمت ہے؟ میں بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔
"ڈاکٹر اشرف نے جناح صاحب کو سمجھانے کی بہتیری کوشش کی کہ کچھ انسان ایسے بھی ہیں، جو خریدے نہیں جا سکتے۔ لیکن جناح صاحب ان سے بار بار یہی کہتے رہے کہ بتاؤ تمھاری کیا قیمت ہے۔ بالآخر ڈاکٹر اشرف اٹھ کر چلے آئے۔"
"ڈاکٹر اشرف نے مسٹر جناح سے نہیں پوچھا" سر آغا خاں نے فرمایا "خود انھوں نے اپنا سودا کس قیمت پر اور کس سے

کیا ہے؟"

"یور ہائی نس آپ کے سوال پر مجھے فنر براکوے[1] کی ایک بات یاد آگئی، جو اس نے اپنی کتاب ان سائیڈ لفٹ[2] میں لکھی ہے۔"

"یہ کتاب میں نے نہیں پڑھی ہے" سر آغاخاں نے کہا "کیا لکھا ہے اس نے؟"

"۱۹۲۷ء میں وہ ہندستان آیا تھا۔ یہاں ہندستانی لیڈروں سے وہ ملا۔ جناح صاحب سے بھی اس نے ملاقات کی۔ ان کے لباس اور ان کی انگریزی کی اس نے بہت تعریف کی ہے۔ ۱۹۲۷ء میں جناح صاحب کانگرس سے الگ ہونے کے باوجود کٹر قوم پرست تھے۔ براکوے نے بھی ان کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن آخر میں وہ لکھتا ہے کہ "مسٹر جناح سے باتیں کرنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ برطانوی سامراج کو جس وقت ہندستانی جنتا کو دو حصوں میں باٹنے کی ضرورت ہوگی، اس وقت مسٹر جناح سے بہتر اور کوئی آدمی اسے نہ مل سکے گا۔"

آج کی گفتگو میں سر آغاخاں نے مسلم لیگ کی روش سے اپنی بے زاری کا کئی بار اظہار کیا۔

"یور ہائی نس!" میں نے دبے دبے انداز میں کہا:

---

1. Faner Brocway
2. Inside Left

"اے بادِ صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست"

"آج سے آدھی صدی پہلے کے حالات میں" سر آغا خاں نے رک رک کر اس طرح کہا، جیسے ماضی کا وہ جائزہ لے رہے ہوں "جن لوگوں نے مسلم لیگ قائم کی تھی، ان کے اختیار میں اس کا نہ قائم کرنا نہیں تھا۔"

ان کے اس جواب میں بے بسی اور لاچاری کی ایک دنیا ہی نہیں بلکہ 'خیر و شر' اور 'جبر و اختیار' کی اس عبرت ناک کش مکش کا اعتراف بھی پوشیدہ تھا، جو بیسویں صدی میں ہندستانی مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

"بہر حال" میں نے کہا:

"خشت اول چوں نہند معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج"

"آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں" سر آغا خاں نے سنجیدگی سے کہا "دیوار کبھی کبھی درمیان سے بھی ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔"

"لیکن مسلم لیگ کے باب میں تاریخ کا شاید یہ فیصلہ نہ ہو" میں نے کہا "ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کی دیوار کج تر ہو گئی ہو۔"

گفتگو اسی منزل تک پہنچی تھی کہ ایک اور ہندستانی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

"آپ مہاراجا بڑودہ ہیں" سر آغا خاں نے تعارف کراتے ہوئے فرمایا "آپ بھی بڑے نیشنلسٹ ہیں۔"

یہ مہاراجا بڑودہ یورپ جاتے یا وہاں سے لوٹتے ہوئے قاہرہ ٹھہرے تھے، اور مینا ہاؤس ہی میں ان کا بھی قیام تھا۔ سر آغا خاں چند منٹ تک ان سے باتیں کرتے رہے، پھر وہ رخصت ہو گئے۔

"میرا ایک کام ہے" میرے رخصت ہونے سے کچھ دیر پہلے سر آغا خاں نے کہا "آپ شاید بہ آسانی کر سکیں گے۔"

"فرمایئے" کہتے ہوئے مجھے آصف علی کی بات یاد آ گئی۔

"شاید آپ کو یہ نہ معلوم ہو کہ آج کل میرا نام برطانوی حکومت کے معتوبین کی فہرست میں درج ہے" انھوں نے تمہید کے طور پر کہنا شروع کیا "میری نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی ہے۔ میری آنے جانے والی ڈاک سنسر کی جاتی ہے۔ ایک خط ہندستان بھیجنا چاہتا ہوں، جو بہت ضروری اور بے حد اہم ہے — یہ ان ہی مسایل کے متعلق ہے، جو ہمارے ملک کو درپیش ہیں، اور جن پر آج چار گھنٹے سے ہم دونوں باتیں کرتے رہے ہیں۔"

"کس کے نام ہے خط؟"

"نواب بھوپال کے نام" انھوں نے جواب دیا "وہی نواب بھوپال جو جناح کی ناک پکڑ کر گھما سکتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ خط سنسر ہو۔ کسی ہندستان جانے والے معتبر مسلمان کے سپرد کر دیجیے، جو ہندستان پہنچنے کے بعد خود جا کر یہ خط نواب صاحب کے ہاتھ میں دے دے۔ ہندستان میں آمد و رفت کا کرایہ میں دوں گا۔"

"قاہرہ سے ہندستان جانے والا آج کل کوئی ہے نہیں اور یوں تو جانے والے بہت مل جائیں گے، لیکن ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔" پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا "ایک صورت سمجھ میں آتی ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو آپ کے لفافے کو ایک دوسرے لفافے میں رکھ کر دہلی بھیج دوں۔ اور آپ کا خط نواب صاحب کو بہ حفاظت تمام پہنچا دیا جائے گا۔ چیمبر آف پرنسس کا آج کل اجلاس ہو رہا ہے اور نواب صاحب دہلی ہی میں ہیں۔"

"یہ صورت ہو سکتی ہے۔ لیکن آپ بھیجیں گے کیسے؟"

"میں جامعہ ملیہ بھیجوں گا۔ وہاں کے بعض کارکن نواب صاحب کے ساتھی اور دوست ہیں، وہ انھیں پہنچادیں گے۔"

"یہ صورت مجھے پسند ہے۔"

سر آغا خاں ڈرائنگ روم سے اٹھ کر اندر گئے، اور پانچ منٹ کے بعد ایک لفافہ لاکر میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے خالص ایرانی لہجے میں فرمایا:

"سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را"

مینا ہاؤس سے نکل کر گھر پہنچا، تو بارہ بجنے والے تھے۔ کپڑے بدل کر لیٹ گیا، اور لیٹے ہی لیٹے آج کی باتوں کے موٹے موٹے اشارے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیے۔ بجلی کا بٹن جو قریب ہی لٹک رہا تھا،

دبا کر روشنی گل کی اور چادر تان لی۔ سونے کی کوشش کے باوجود نیند نہ آئی۔ آغا خاں نے جتنی باتیں کی تھیں، میرے ذہن کے فانوس میں چکر لگا رہی تھیں۔ ان کی آواز میرے کان میں اس طرح گونج رہی تھی، جیسے ٹیپ ریکارڈر[1] بج رہا ہو — "آج کل میرا نام برطانوی حکومت کے معتوبین کی فہرست میں درج ہے۔ میری نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی ہے، میری آنے جانے والی ڈاک سنسر کی جاتی ہے۔" ساتھ ہی یہ سوال میرے سامنے آگیا کہ ایسا کیوں ہے؟ سر آغا خاں تو حکومت برطانیہ کے ہوا خواہ اور اس کی ناک کا بال تھے۔ اب اک بارگی یہ انقلاب! آخر یہ ہوا کیا؟ مجھے افسوس تھا کہ سر آغا خاں نے جب یہ بات کہی تھی، اس وقت میرا ذہن اس سوال کی طرف کیوں منتقل نہ ہوا۔ میں تو کسی نہ کسی انداز سے یہ سوال کر ہی ڈالتا۔ پھر مجھے کچھ کچھ یاد آیا کہ لڑائی کے دنوں میں آغا خاں کی ہمدردیاں محوری فاشستی طاقتوں کے ساتھ ہو گئی تھیں، نہ جانے کیوں؟ اسی بنا پر یورپ کے کسی اتحادی ملک میں شاید وہ گرفتار بھی ہوئے تھے، اور غالباً اسپین میں نظر بند بھی رہے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ انسان کی ذرا سی چوک اس کی ساری عمر کی کمائی پر کس طرح پانی پھیر دیتی ہے۔ ساتھ ہی ملک قمی کا وہ شعر مجھے یاد آیا، جسے فیضی نے اس کے ضخیم دیوان کا حاصل قرار دیا تھا۔ اکبر کے دربار میں جب ملک قمی کا دیوان پیش ہوا تو

---

[1] Tap-recorder

انتخاب مرتب کرنے کی خدمت اس نے فیضی کے سپرد کی۔ کچھ مدت کے بعد اکبر کے سامنے کسی نے ملک قمی کا نام لیا تو اس نے فیضی سے پوچھا کہ انتخاب تیار ہوگیا یا نہیں؟ اس کا اثبات میں جواب دیتے ہوئے، فیضی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ پورے دیوان میں ایک ہی شعر ہے، اور وہ یہ ہے:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

مولانا آزاد نے اس شعر سے زیادہ فیضی کو داد دیتے ہوئے کسی جگہ لکھا ہے کہ اس نے اپنے حسن انتخاب کا کیا ہی "مرقص ثبوت" دیا ہے۔ اصغر گونڈوی نے بھی اسی خیال کو اپنے انداز میں پیش کیا ہے:

تہر ہے تھوڑی سی بھی غفلت طریق عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا[1]

کچھ دیر تک میں سوچتا رہا کہ قمی اور اصغر کے مکان زمان

---

[1] "سرود زندگی" کے دیباچے میں مولانا آزاد نے اصغر کے کلام کا جو انتخاب پیش کیا ہے اس میں پہلا شعر یہی ہے، لیکن حیرت ہے کہ سرود زندگی میں سرے سے وہ غزل ہی نہیں ہے، جس میں یہ شعر رہا ہوگا۔ یہ غزل "نشاط روح" میں بھی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ مولانا آزاد کا ذہن اس طرف بھی منتقل نہ ہوا کہ اصغر نے اس شعر کا خیال قمی سے مستعار لیا ہے۔

کے اختلاف کے باوجود، ان دونوں اشعار میں اتنا قریبی ربط کیوں ہے؟ اور اس ادھیڑ بن میں سر آغا خاں کو میں بھول گیا۔ پھر آنکھ لگ گئی۔ لیکن نیند کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ یکایک آنکھ کھلی۔ روشنی کا بٹن بے ارادہ میں نے دبایا اور کمرے کی تاریکی روشنی میں بدل گئی۔ پلنگ سے اٹھا اور غیر شعوری طور پر اس میز کے قریب گیا، جہاں سر آغا خاں کا "خواب زبا" خط رکھا تھا۔ کچھ دیر اسے گھورتا رہا، پھر میں نے اٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی نفسیاتی الجھن کا سبب، اور اس کا علاج بھی، میری سمجھ میں آگیا۔ لیکن ضمیر یہ نسخہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ سامنے ہی پیڈ پڑا ہوا تھا، میں خط لکھنے بیٹھ گیا —— "یہ ایک بے حد ضروری اور اہم خط ہے، جو نواب صاحب بھوپال کے نام لکھا گیا ہے۔ مہربانی کر کے آپ خود اسے لے جائیں، اور نواب صاحب کے ہاتھ میں دیں۔"

آغا خاں کے خط کے ساتھ اسے ایک بڑے لفافے میں رکھ کر ٹکٹ لگائے، اور بند کر کے پتا لکھا۔ اور ارادہ کیا کہ ابھی جا کر اسے لیٹر بکس میں ڈال دوں جو میرے گھر سے متصل ہی تھا۔ لیکن خیال آیا کہ نیچے اتر کر دروازہ کھولا، تو بوڑھی صاحب خانہ جاگ جائیں گی، جو بلّی کی نیند سوتی ہیں۔

میں پھر بستر پر لوٹ آیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد نیند آگئی۔ اب میں نے خواب دیکھنا شروع کیا۔ میرے سامنے

کٹھ پتلیوں کا ناچ ہو رہا ہے۔ کردار وہی جانے پہچانے ہندستانی ہیں، جن کا گذشتہ شام ہم ذکر کر رہے تھے۔ پھر یہ کٹھ پتلیاں آپس میں لڑنے لگیں، اور ایک عجیب قسم کا شور ہونے لگا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دیکھنے کے لیے روشنی کی۔ اس وقت چار بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ گھڑی کی بغل ہی میں لفافہ رکھا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ ذہنی کشمکش، جو کچھ دیر کے لیے تحت الشعور میں چلی گئی تھی، پوری شدت سے ابھر کر بالائے شعور آگئی۔ بڑھ کر لفافہ اٹھایا، اوپر کا لفافہ چاک کر کے سر آغا خاں کا لفافہ میں نے نکالا ہی تھا کہ واہمہ نے سر آغا خاں کو سامنے لا کھڑا کیا۔ وہ کہہ رہے تھے ——

"یہ خط بہت ضروری اور بے حد اہم ہے، ان ہی قومی مسایل کے متعلق جو آج ہمارے ملک کو درپیش ہیں، اور جن پر آج چار گھنٹے سے ہم باتیں کر رہے ہیں۔"

"یور ہائی نس" میں نے جواب دیا "یہی بات ہے تو پھر اسے پڑھنے کا مجھے اتنا ہی حق ہے، جتنا آپ کو لکھنے کا تھا۔"

"اسے کھول کر پڑھنے سے فایدہ؟" ضمیر نے نصیحت کی "سب باتیں تمھیں معلوم ہی ہیں۔ یہ گناہ بے لذّت ہوگا۔"

"بھئی! کسی کا کوئی اعتبار نہیں" دل نے کہا "رات ہی مہاراجا بڑودہ کا تعارف کراتے ہوئے سر آغا خاں نے کہا تھا کہ آپ بھی بڑے نیشنلسٹ ہیں۔ یہ اگر نیشنلسٹ ہیں،

تو پھر میرے جیسے لاکھوں آدمی کیا ہیں!"
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

دل کی اس دلیل نے ضمیر کو لاجواب کر دیا۔ میں نے بڑھ کر گلاس اٹھایا، جو قریب ہی رکھا تھا۔ پانی کے چند قطرے اس شیشے پر ٹپکائے جو میز پر بچھا تھا۔ پھر پانی کو اس پر پھیلایا، اور لفافے کو، جدھر سے وہ بند کیا گیا تھا، شیشے پر رکھ کر ایک موٹی سی کتاب سے دبا دیا۔ بڑھ کر میں نے کھڑکی کھولی، جس کا رُخ سڑک کی طرف تھا۔ ٹھنڈی ہوا ایک جھونکا کمرے میں اس طرح داخل ہوا، جیسے دیر سے کھڑکی کھلنے کا بے چینی سے وہ انتظار ہی کر رہا تھا۔ پو پھوٹ چکی تھی۔ آنے والی صبح کی مدھم گلابی روشنی نے رات کی کمھلائی ہوئی سیاہی میں حل ہو کر ایک عجیب رنگ اختیار کر لیا تھا۔ کھڑکی سے لگا کچھ دیر کھڑا رہا۔ میرے سامنے قاہرہ کے ایگری کل چرل[1] میوزیم کی وسیع عمارت تھی، جہاں روشنی کے زرد زرد بے نور سے لاتعداد قمقمے گزری ہوئی رات کی اس تاریکی کے ماتم گسار تھے، جس نے ان کی درخشندگی اور تابندگی کو دو بالا کیا تھا۔ نسیم صبح کے تیز تیز جھونکوں نے میرے جسم کے ہر ہر عضو سے زیر و زبر ہو کر بے خوابی کے تمام اثرات یک سر زایل کر دیے۔

---

[1] Agricultural - Museum

اب میرا دماغ بالکل ہلکا ہو چکا تھا۔ حافظ کا ایک شعر بے اختیار زبان پر آ گیا:

خوشش باد انسیم صبح گاہی

کہ دردِ شب نشیناں را دوا کرد

میں نے مڑ کر غسل خانے کا رخ کیا، ٹب کا نل کھول کر کچھ دیر کھڑا رہا، جب وہ بھر گیا، تو پانی گرم کرنے کا آلہ اس میں ڈال کر بجلی کا بٹن دبا دیا۔ پھر دبے پاؤں زینے کی سیڑھیاں طے کر کے نیچے کی منزل میں گیا، اور باورچی خانے میں روشنی کی۔

"کون ہے؟" بوڑھی لینڈ لیڈی نے ڈپٹ کر للکارا۔ آواز کے کرارے پن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اُٹھ چکی ہیں۔

"میں ہوں" میں نے معذرت کے لہجے میں سوال کیا "آپ اٹھ چکی ہیں؟"

"ہاں اٹھ چکی ہوں۔"

"رات میں سو نہیں سکا۔ طبیعت بہت کسل مند ہے" میں نے درخواست کرتے ہوئے کہا "آپ اگر چائے پلا دیں تو ممکن ہے کہ کسل کچھ دور ہو۔"

"اچھی بات ہے تم اوپر چلو، میں پندرہ منٹ میں چائے دیتی ہوں۔"

"میں نہانے جا رہا ہوں، اور غسل خانے میں پندرہ منٹ سے زیادہ میں بھی نہ لگاؤں گا۔"

"دیکھو ٹھنڈے پانی سے نہ نہانا"
"شکریہ، پانی میں نے گرم کر لیا ہے۔"
نہانے کے بعد غسل خانے سے نکل کر کپڑے پہنے ہی تھے کہ میری مہربان خاتون نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور چائے کا طشت ان کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھ دیا۔
"اور کچھ چاہیے؟" خاتون نے لوٹتے ہوئے سوال کیا۔
"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے اس وقت ـــــ"
"بس رہنے دو، صبح صبح میرا دماغ خراب نہ کرو۔"
خاتون کے جانے کے بعد میں نے چائے بنائی، اور دو گھونٹ پی کر خط کی طرف متوجہ ہوا، جو اب تک کتاب کے نیچے دبا تھا۔ دیر تک میں اسے تکتا رہا، جیسے کوئی لفافے ہی کو دیکھ کر خط کا مضمون بھانپنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پیالی کی باقی چائے بھی اب ختم ہو چکی تھی۔ دوسری پیالی بنا کر میں نے لفافہ اٹھایا، جو خاصا ضخیم ہو چکا تھا۔ ہلکی سی جنبش سے وہ کھل گیا۔ بڑی احتیاط سے میں نے خط نکالا۔ بڑے سے ایر میل کاغذ کے یہ ورق تھے، اور دونوں طرف سیاہ تھے۔ الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ آغا خاں کا انگریزی خط پختہ مگر صاف اور اچھا تھا، جسے پڑھنے میں دقت نہیں ہو سکتی تھی۔ خط کو ایک طرف رکھ کر چائے کی دوسری پیالی بھی میں نے ختم کی۔ اٹھ کر جیب سے سگریٹ کیس اور

لائٹر نکالا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ خط کھول لینے کے بعد اس سے میری دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ شاید میرے وجود کی اتھاہ گہرائیوں میں یہ کشمکش اب بھی جاری تھی کہ اسے پڑھا جائے یا پھر اسے لفافے میں رکھ دیا جائے۔ سگریٹ سلگانے کے بعد چائے کی تیسری پیالی میں نے بنائی، اور خط کو فیصلہ کن انداز میں اٹھایا — "مائی ڈیر حمید اللہ خاں" لکھنے کے بعد خط اس طرح شروع کیا گیا تھا:

"تمھیں معلوم ہے میں نے ساری عمر لہو و لعب میں بسر کی ہے۔ مرنے سے پہلے اسلام کی کچھ خدمت کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی قدرتی خواہش میں اپنے اندر پا رہا ہوں۔ آج عالمِ اسلام کی جو حالت ہے، روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس وقت فلسطین کا مسئلہ اسلام کا اہم ترین مسئلہ ہے، جو یُو، این، اُو کے آئندہ اجلاس میں آنے والا ہے۔ اس موقع پر میں اگر وہاں رہا، تو کچھ مفید خدمت انجام دے سکوں گا۔ اسی کے پیشِ نظر میری خواہش ہے کہ یُو، این، اُو کے آئندہ اجلاس کے لیے، ہندستان کا جو وفد جائے، اس میں میرا نام بھی ہو۔

"میری حیثیت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ میں ہی وفد کا لیڈر مقرر کیا جاؤں، لیکن موجودہ حالات

میں یہ اَن ہونی بات ہے۔ اسی احساس کے پیشِ نظر
میں تو وجے لکشمی کے رفیق کی حیثیت سے بھی جانے
کے لیے تیار ہوں۔

"اس کام کے لیے مہربانی کر کے زمین تم ہموار
کرو۔ جواہر لال تو مجھ سے بدظن ہیں، مگر مولانا آزاد
مجھے برا نہیں سمجھتے۔ جواہر لال سے تمھارے تعلقات
خوشگوار ہیں۔ تم ان سے باتیں کرو اور مولانا
سے بھی ملو۔ میں مارچ (۱۹۴۷ء) میں ہندستان
آؤں گا۔ اس وقت میں بھی ان لوگوں سے ملوں گا۔"

خط کا دوسرا حصہ، جو ہندستان کے ان "قومی مسایل کے متعلق" تھا، صرف آدھے صفحے پر پھیلے ہونے کے باوجود یقیناً "بہت ضروری اور بے حد اہم" تھا۔

"ہندستان کے حالات میرے لیے تکلیف دہ ہیں۔
مسٹر جناح کا اب مجھے کوئی ڈر نہیں ہے[1]، یہ خط تم انھیں

---

[1] یہ بات نہ تو اس وقت میری سمجھ میں آئی تھی، اور نہ آج آتی ہے کہ پہلے سر آغا خاں مسٹر جناح سے کیوں ڈرتے تھے؟ اور اب "مسٹر جناح کا" انھیں "کوئی ڈر" نہیں رہا تھا۔ ان کا انگریزی جملہ یہ تھا:

I am no more afraid of mr. Jinah you can place this letter before him.

دکھا سکتے ہو۔ مہربانی کر کے میری طرف سے ان سے کہو
کہ مسلم لیگ اب ہندستان کی آزادی کی راہیں روک
نہیں سکتی۔ اس وقت اس کے سامنے دو راہیں ہیں:
ایک تو یہ ہے کہ کانگرس سے وہ باعزت سمجھوتہ کر لے۔
دوسری یہ ہے کہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے لیے
تیار ہو جائے۔ میں پہلی راہ کو ترجیح دیتا ہوں۔"

خط کو احتیاط سے لفافے میں رکھ کر میں نے بند کیا۔ پھر اپنے خط کے ساتھ دوسرے بڑے لفافے میں رکھا۔ ان منزلوں کو احتیاط و اہتمام سے طے کر کے بہ عجلت تمام لفافے کو لیٹر بکس کے حوالے کر دیا۔

"خط کی رسید آگئی ہے۔" دس بارہ دن کے بعد سر آغا خاں نے ٹیلیفون پر مجھے اطلاع دی۔

آخری باب

ایشیائی کانفرنس کی تاریخیں — ۲۸ تا ۳۱ مارچ — جوں جوں قریب آتی گئیں، کانفرنس کی سرگرمیاں بھی تیز تر ہوتی گئیں۔ مارچ کی ابتدائی تاریخوں میں میرے توجہ دلانے پر ایک صاحب کانفرنس کے نمایندے کی حیثیت سے دہلی سے قاہرہ آئے۔ مولوی کرم علی اور مولانا عبدالعلیم کے رخصت ہونے کے بعد مسز نائیڈو کو میں نے لکھا تھا کہ مسلم لیگ کے اُن سفیروں کو قاہرہ میں تو کامیابی نہیں ہو سکی ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ بغداد، بیروت اور دمشق میں ان کی کوششیں رنگ لائیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ کوئی بھاری بھرکم آدمی، کانفرنس کے نمایندے کی حیثیت سے عرب ملکوں کا دورہ کرے۔ اس کام کے لیے ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کا نام بھی میں نے تجویز کیا تھا، لیکن اپنی بعض مصروفیتوں کے پیش نظر وہ نہ آسکے، ان کی جگہ پر جو صاحب آئے، وہ آل انڈیا ریڈیو کے

کسی شعبے سے وابستہ تھے ان کا آنا نہ آنا، جہاں تک قاہرہ کا تعلق ہے، برابر ہی رہا۔ کیوں کہ عرب لیگ اور مصری حکومت نے نیز مصری خواتین کی مرکزی انجمن نے پہلے ہی کان فرنس کا دعوت نامہ قبول کرنے کا اعلان کر دیا تھا، اور کسی کو مدعو کرنا تھا نہیں۔ دوسرے عرب ملکوں کے بارے میں میرا خدشہ صحیح ثابت ہوا، اور انھیں کوئی خاص کامیابی نہ ہو سکی۔

مارچ کے پہلے ہفتے میں ایک مصری دوست سے یہ معلوم کر کے مجھے حیرت ہوئی کہ اخوان المسلمون بھی کان فرنس کا دعوت نامہ حاصل کرنے کی متمنی ہے۔ حیرت اس لیے ہوئی کہ مصر میں اخوان ہی ایک ایسی جماعت تھی جو مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی دل و جان سے حامی تھی۔ چند روز کے بعد اخوان کے بانی اور روح رواں حسن البنّا سے ایک مشترک دوست کے یہاں ملاقات ہوئی تو انھوں نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا۔ کان فرنس سے اپنا عدم تعلق ظاہر کرتے ہوئے انھیں میں نے مشورہ دیا کہ اپنی اس خواہش کو وہ دہلی سے براہِ راست رجوع کریں۔

اس ملاقات کے دو تین دن بعد یہ راز کھلا کہ مولوی کرم علی اور مولانا عبدالحلیم نے اخوان کو آمادہ کیا تھا کہ وہ کان فرنس کا دعوت نامہ حاصل کرے اور کان فرنس کے اسٹیج سے اس کی مخالفت میں آواز بلند کرے۔

اسی اسکیم پر عمل کرتے ہوئے اخوان نے کانفرنس کا باضابطہ دعوت نامہ حاصل نہ کر سکنے کے باوجود اپنا ایک نمائندہ دہلی بھیج ہی دیا، جس نے وہاں پہنچنے کے بعد کانفرنس کے خلاف بیانات دیئے، جو ہندستان کے مسلم لیگی پریس نے جلی سرخیوں کے ساتھ شایع کیے۔

وسط مارچ میں افریقہ سے ایک تار قاہرہ کی انڈین یونین کے نام آیا، جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ جنوبی افریقہ کی انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ڈاکٹر نائکر اور یوسف داود ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لیے دہلی جاتے ہوئے قاہرہ میں بھی دو تین دن قیام کریں گے۔ ائرپورٹ پر ان سے ملاقات کی جائے۔ اس تار نے عرب لیگ سے میرا رشتہ منقطع کرنے میں، غیر محسوس طور پر، نمایاں حصہ لیا۔

دوسرے دن دفتر پہنچا تو میری میز پر دو تار رکھے تھے، جو عرب کے نام تھے۔ ان میں سے ایک تو جنوبی افریقہ کی انڈین نیشنل کانگرس کا تھا، جس میں عزام پاشا سے ڈاکٹر نائکر اور یوسف داود سے ملاقات کا وقت مانگا گیا تھا۔ دوسرا تار بھی جنوبی افریقہ ہی سے آیا تھا جس میں نائکر اور داود کے کمیونسٹ لیڈر ہونے کا انکشاف کرتے ہوئے ان سے نہ ملنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ یہ دوسرا تار جنوبی افریقہ کی مسلم لیگ کے صدر مسٹر قاضی کا تھا۔ اس تار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی مضمون کا پیغام وزیر اعظم نقراشی کو بھی بھیجا گیا ہے۔ یہ دونوں تار میں نے عزام پاشا کی خدمت میں پیش

کر دیے جو ان کی ہدایت کے مطابق داخلِ دفتر کر دیے گئے۔

ڈاکٹر نائکر اور یوسف داؤد سے ائرپورٹ پر ملاقات کرنے کی ذمے داری انڈین یونین کے وائس پریسیڈنٹ ریاض الدین فاروقی نے لی تھی لیکن عین وقت پر ایک حادثہ پیش آنے کی وجہ سے، ان کی جگہ پر مجھ ہی کو ائرپورٹ جانا پڑا۔ ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے صورت آشنا نہ تھا۔ لیکن جب مسافر ہوائی جہاز سے اترے تو ڈاکٹر نائکر کے رنگ اور چہرے مہرے سے میں نے انھیں پہچان لیا۔ ہم دونوں نے اشاروں سے بات چیت کی اور اس کے ساتھ ہی پاسپورٹ اور کسٹم کی کارروائی شروع ہوگئی۔ میں باہر لاؤنج میں ان دونوں کا انتظار کرنے لگا۔

سارے مسافر ایک ایک کرکے نکل گئے، لیکن ان دونوں کا نمبر کسی طرح نہ آیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد جب میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ دونوں پاسپورٹ افسر کے کمرے میں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے مسٹر قاضی کا تار یاد آگیا، جس میں ان کے کمیونسٹ ہونے کا انکشاف کیا گیا تھا۔ یہ بات یاد آتے ہی مجھے کچھ تشویش ہوئی، کیوں کہ مصر میں کمیونسٹوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ ابھی میں اس پہلو پر غور کر ہی رہا تھا کہ پولیس کے ایک افسر نے آکر مجھ سے پوچھا کہ دکنی افریقہ سے جو دو مسافر آئے ہیں ان کو لینے کے لیے میں ہی آیا ہوں؟ جواب میں نے اثبات میں دیا تو وہ مجھے اپنے ساتھ پاسپورٹ افسر کے کمرے میں لے گیا۔

"آپ ان دونوں کو جانتے ہیں؟" پاسپورٹ افسر نے مجھ سے سوال کیا۔

"میں انھیں یقیناً جانتا ہوں" میں نے جواب دیا "لیکن ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں۔ یہ دونوں جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کے لیڈر ہیں۔ اور اسی رشتے سے میں انھیں لینے آیا ہوں۔"

"آپ بھی ہندستانی ہیں؟"

"جی ہاں میں یقیناً ہندستانی ہوں۔"

"آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟"

"میں عرب لیگ میں ملازم ہوں۔"

"عرب لیگ میں؟"

"جی ہاں عرب لیگ میں" میں نے جواب دیا "آپ کو کچھ تعجب ہوا؟"

"ہاں تعجب ضرور ہوا" پولیس افسر نے جواب دیا "کیوں کہ یہ دونوں کمیونسٹ ہیں۔ اچھا آپ ان کی ضمانت لیتے ہیں؟"

"کس بات کی ضمانت؟"

"اس بات کی کہ یہ لوگ یہاں کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لیں گے۔"

"یہ لوگ تو موسمی چڑیوں کی طرح یہاں آئے ہیں" میں نے جواب دیا "کل یا پرسوں چلے جائیں گے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ دونوں عزام پاشا اور نقراشی پاشا سے جنوبی افریقہ

کے ہندستانیوں کے مسائل پر بات چیت کرنا چاہتے ہیں.
کیا ان کے پاس یہاں کا ویزا نہیں ہے؟"
"آپ میری بات کا جواب دیجیے" پاسپورٹ افسر نے کہا
"ٹرانزٹ ویزا تو ان کے پاس ہے، جو برطانوی سفارت خانے نے دیا ہے، لیکن کمیونسٹوں کا مصر میں داخلہ ممنوع ہے۔ آپ کی ضمانت پر میں انھیں شہر جانے کی اجازت دوں گا، ورنہ یہیں ہوائی اڈے پر یہ ٹھہریں گے اور دہلی جانے والے پہلے جہاز سے انھیں روانہ کر دیا جائے گا۔"
"اچھی بات ہے، میں ان کی ضمانت لیتا ہوں۔"
سوال و جواب کے بعد پاسپورٹ افسر نے چند کاغذات میری طرف بڑھائے جن کی میں نے خانہ پُری کر دی۔ ایک دوسرے کاغذ پر اس نے میرے پاسپورٹ کی تفصیلات نوٹ کیں اور اسے بھی ان کاغذات کے ساتھ منسلک کر دیا، جن کی میں نے خانہ پُری کی تھی۔
ڈاکٹر نائیکر اور یوسف داود تین دن قاہرہ میں ٹھہرے نقراشی پاشا سے تو ان کی ملاقات نہیں ہوئی لیکن عزام پاشا اور دوسرے مصری لیڈروں سے وہ ملے۔ عزام پاشا سے ملاقات کے وقت میں موجود تھا۔ ان لوگوں نے جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کے مسئلے پر ان سے بات چیت کی اور فلسطین کے معاملے میں جنوبی افریقی ہندستانیوں کی ہمدردی کا یقین دلایا۔ قاہرہ سے ان لوگوں کی روانگی کے تیسرے دن

عزام پاشا نے مجھے بُلا کر پوچھا:
"جنوبی افریقہ کے آنے والے ہندستانیوں کی آپ نے ضمانت لی تھی؟"
"جی ہاں میں نے ان کی ضمانت لی تو تھی۔"
"مصری وزارت داخلہ نے اس کی شکایت ہی نہیں کی ہے بلکہ احتجاج کیا ہے" عزام پاشا نے کہا "اس سے پہلے بھی دو بار وزارت خارجہ آپ کی سرگرمیوں کی رپورٹ بھیج چکی ہے۔"
"نا گزیر اور دارد کی ضمانت جب میں نے لی تھی" پوری صورت حال بیان کرتے ہوئے میں نے کہا "تو اس کے عواقب بھی میرے سامنے تھے، لیکن اس وقت ان کی ضمانت لینے کے علاوہ اور کوئی راستہ میرے سامنے نہ تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس سلسلے میں عرب لیگ کی پوزیشن کچھ مجروح ہوئی۔"
اسی گفتگو میں ایشیائی کانفرنس میں میرے جانے کا جب ذکر آیا، تو میں نے محسوس کیا کہ عزام پاشا کو اس میں کچھ تامل ہے، اگرچہ ابتدا میں خود ان ہی کی یہ تجویز تھی کہ عرب لیگ کے ڈیلی گیشن کے سکریٹری کی حیثیت سے مجھے جانا چاہیے۔ لیکن میرے اصرار پر مجھے دہلی بھیجنے کا انھوں نے فیصلہ کر لیا۔

۲۴ مارچ کی سہ پہر کو میں قاہرہ سے دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ میرے دہلی پہنچنے کے دوسرے دن عرب لیگ کا وفد بھی دہلی

پہنچا۔ وفد کے لیڈر عزام پاشا کے چچا زاد بھائی ڈاکٹر عبدالوہاب عزام تھے۔ قاہرہ کی فوادادل یونیورسٹی میں وہ کسی شعبے میں پروفیسر تھے عملی سیاست سے تو ان کا کوئی تعلق نہ تھا، لیکن سیاسی ذہن ضرور رکھتے تھے اور عزام پاشا کے برعکس مسلم لیگ سے ہمدردی رکھتے تھے۔

کانفرنس کے دوران مسلم لیگ کے حلقوں نے 'اخوان المسلمین' کے نمایندے کی وساطت سے ڈاکٹر عزام پر خصوصیت سے 'کام' کیا۔ اور دہلی سے وہ خاصے "مسلم لیگی" بن کر واپس لوٹے۔ ان کے اسی ذہن کا، قدرتی طور پر، میں نشانہ بنا۔

ایشیائی کانفرنس کی تفصیلات اور اس کے بعد کی داستان پیشِ نظر کتاب کے دوسرے حصے کا جزو ہے۔